Registered No. L. 4186

ذی القعدة ۱۳۵۷ھ

جلد ۱۳ — عدد ۵

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دار الاسلام (پٹھان کوٹ - پنجاب)

قیمت سالانہ پانچ روپے

قیمت فی پرچہ ۸ آنے

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام مختصر فہرست مضامین حسبِ ذیل ہے:-

۱- اسلامی جہاد کی حقیقت اسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیمِ جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روحِ جہاد کا کیا مرتبہ ہے

۲- مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

۳- مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں

۴- اشاعت اسلام اور تلوار- دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعتِ اسلام میں تلوار کا کیا حصّہ ہے۔

۵- قوانینِ جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور اُن میں اسلام کی اصلاحات۔

۶- جنگ دوسرے مذاہب میں- جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مت، یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ۔

۷- جنگ اور تہذیب جدید- بین الاقوامی قانونِ جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ- قیمت مجلد ۵؎ غیر مجلد للعہ

رسالہ دینیات یہ رسالہ سرکار آصفیہ کے محکمہ تعلیمات نے میٹرک کے طلبہ کو پڑھانے کیلئے لکھوایا ہے - اور علمائے دکن کی ایک مستند مجلس اسکی تالیف میں شریک مشورہ رہی ہے۔ مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے- اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصولِ شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علماء بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۰/

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجیے

فہرست مضامین

ماہ ذی القعدہ ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۳۹ء جلد ۱۳ عدد ۵

اشارات۔ ابوالاعلیٰ مودودی ۳۲۳

مقالات:

دین میں تحریف اور بدعت کے اسباب — ازافادات حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ۳۳۳

دلائل السنن والآثار — جناب مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی ۳۴۱

تنزیل وتاویل:۔

امثال القرآن — جناب مولوی محمد ایوب صاحب جیراجپوری ۳۵۷

سورۂ صافات کی قسمیں — جناب مولوی داؤد اکبر صاحب اصلاحی ۳۶۸

رسائل ومسائل:۔

صفات باری تعالیٰ — ابوالاعلیٰ مودودی ۳۸۰

خطبات جمعہ:۔

خطبۂ صیام — ابوالاعلیٰ مودودی ۳۸۴

مطبوعات۔ "ص" ۳۹۲

باہتمام چودھری نیاز علی خاں صاحب پرنٹر وپبلشر گیلانی الکٹرک پریس لاہور

میں طبع ہو کر دارالاسلام نزد پٹھان کوٹ سے شائع ہوا

ضروری اطلاع

ادارۂ دارالاسلام کی مجلس شوریٰ کے فیصلہ کے مطابق ادارہ کا مرکز اور اسکے ساتھ ترجمان القرآن کا دفتر ۵ ذی الحجہ ۵۷ھ (۲۶ جنوری ۳۹ء) کو بستی جمال پور سے لاہور منتقل ہو جائیگا۔ لہذا تاریخ مذکور کے بعد ادارۂ دارالاسلام اور دفتر ترجمان القرآن سے جملہ مراسلت ذیل کے پتہ پر کی جائے:-

پونچھ روڈ۔ مبارک پارک۔ لاہور

معاصرین سے بھی گذارش ہے کہ آئندہ اپنے موقر رسائل وجرائد مذکورۂ بالا پتہ پر ارسال فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

آج کی اشاعت میں پہلے صفحہ پر ناظرین کو یہ اعلان دیکھ کر حیرت ہوگی کہ ادارہ دارالاسلام کا مرکز اور ترجمان القرآن کا دفتر اس مقام سے (جس کا نام ہی اس نصب العین کی رعایت سے دارالاسلام رکھا گیا تھا) منتقل ہو رہا ہے۔ بلکہ جو حضرات اس اسکیم سے نسبتہً زیادہ گہری دلچسپی لیتے رہے ہیں ان کے لیے تو یہ امر شاید حیرت سے بڑھ کر کچھ پریشانی کا بھی موجب ہو۔ اس لیے مختصراً اس نقل مکان کے وجوہ واسباب کی طرف اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، ورنہ قابلِ ترجیح تو یہی تھا کہ یہ معاملہ یونہی خاموشی کے ساتھ گذر جاتا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس ادارہ کے تخیل کو کسی خاص مقام یا سرزمین سے کوئی تعلق نہیں ہے حقیقتہً دارالاسلام تو ہندوستان میں کوئی ایک چپہ بھر زمین بھی نہیں۔ البتہ ہمارا مقصد پورے ہندوستان کو دارالاسلام بنانا ضرور ہے سو اس مقصد کے لیے اس جزیرہ نما کے ہر خطہ میں ادارہ دارالاسلام قائم ہو سکتا ہے۔ رہا یہ خاص مقام، تو اس کو میں نے شخصی طور پر بعض حضرات کی دعوت اور وعدۂ اعانت پر ایک ایسی نمونہ کی بستی کے لیے پسند کیا تھا جہاں دارالاسلام کا نصب العین رکھنے والے ہر حصہ ملک سے سمٹ کر مجتمع ہو سکیں اور اپنے مقصد کے لیے اجتماعی سعی وجہد کرنے کی قوت وقابلیت بہم پہنچا سکیں۔ اسی خیال کو سامنے رکھ کر میں حیدرآباد سے یہاں ڈیڑھ ہزار میل تک اپنا گھر بار اٹھا لایا تھا اور اپنے نزدیک یہ سمجھ رہا تھا کہ شائد یہی میرا مستقر بھی ہوگا اور مستودع بھی۔

لیکن جب ادارہ باقاعدہ قائم ہوا اور رفقائے کار مجتمع ہوئے تو تمام حالات کو سامنے رکھ کر بالاتفاق

یہ رائے قائم کی گئی کہ جو مقاصد اور اصول ہمارے پیش نظر ہیں ان کے تتبع میں کام کرنے کا موقع یہاں نہیں مل سکتا۔ خود میرا اپنا دس مہینہ کا تجربہ بھی اسی پر شاہد تھا۔ لہٰذا یہ طے ہوا کہ ادارہ کا مرکز یہاں سے کسی مناسب تر مقام پر منتقل کر دیا جائے، اور اس کے لیے متعدد حیثیات سے لاہور کو پسند کیا گیا۔

جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں ہمیں کسی زمین کی خاک سے کوئی دلچسپی و محبت نہیں ہے۔ محبت اُس نصب العین سے ہے کہ اللہ کا کلمہ سب کلموں پر غالب اور اس کا قانون سب قوانین سے بالاتر ہو۔ اس کے لیے اُس مقصود کے پیچھے جہاں جہاں جانے کی ضرورت ہوگی جائیں گے اور جس جس سرزمین کی خاک چھاننی پڑیگی چھانیں گے۔ مقصد اگر عزیز ہے تو اس کے لیے ہر زحمت گوارا ہونی چاہیے، اور زحمت اگر خوفناک ہے تو مقصد کا نام بھی زبان پر نہ آنا چاہیے، خصوصاً دارالاسلام جیسے مقصد عالی کا نام جسے زبان پر لانے کا حق ہی اس وقت تک کسی کو نہیں پہنچتا جب تک کہ اس کے قلب پر لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ کی عزیمت اور اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ کے سودے پر کامل رضامندی ثبت نہ ہو جائے۔

اس نقل مقام سے ادارہ کے دستور العمل اور لائحہ عمل میں ان شاء اللہ یک سر مو فرق نہ آئے گا۔ البتہ اس لائحہ کا صرف یہ حصہ سر دست معرض التوا میں رہے گا کہ شہری آبادی سے ہٹ کر ایک علٰحدہ مقام میں دارالاسلامی ماحول پیدا کیا جائے اور وہاں تعلیم و تربیت کے اسباب فراہم کئے جائیں۔ بلاشبہ یہی اس ساری اسکیم کی جان ہے، لیکن جس خدا کے نام پر یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے اس سے کچھ بعید نہیں کہ اس کا بھی سامان کر دے وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ۔

ادارہ کا باقاعدہ قیام اگرچہ حال ہی میں ہوا ہے لیکن اس کے لیے عملی جد و جہد شروع ہوئے

پورا ایک سال ہو چکا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ایک سال کے واردات وصادرات کا (آغاز ۵ ذی القعدہ ۱۳۵۷ھ، جنوری ۱۹۳۹ء تک) پیش کر دیا جائے۔

خرچ		جمع	
۴۵۸—۰—۶	طباعت لٹریچر	۸۸۸—۲—۹	عطایا جو معاونین ادارہ سے وصول ہوئے
۱۵۲—۶—۹	ڈاک خرچ	۲۰۰—۰—۰	عطیہ چودھری نیاز علی خاں صاحب
۴۹—۱۳—۰	اسٹیشنری	۳۵۷—۳—۳	فروختِ کتب
۳۱—۶—۹	متفرق سامان برائے ضروریاتِ ادارہ	۳۸—۵—۰	زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ
۱۸۵—۱۰—۰	تنخواہ ملازمین	۴۶—۱۰—۹	از ابوالاعلیٰ بصورتِ کرایہ مکان [1]
۲۰۱—۱۴—۳	قرض حسنہ بنام عزیز ہندی صاحب	۴۹—۸—۰	از ابوالاعلیٰ و دیگر ارکانِ ادارہ بابت قیمتِ غلہ [1]
۱۳—۱۰—۳	مصارف دورۂ عزیز ہندی صاحب	۱۵۷۹—۱۳—۹	
۲—۴—۰	خیرات از مد زکوٰۃ		
۱۰۹۵—۱—۶			

جملہ آمدنی	۱۵۷۹—۱۳—۹
جملہ خرچ	۱۰۹۵—۱—۶
بقایا	۴۸۴—۱۲—۳

اس بقایا میں سے جناب چودھری نیاز علی خاں صاحب کے مطالبہ پر ۲۵۲ روپے ۲ آنے ان کو نقد واپس کیے گئے اور اسٹیشنری (جو ۹ جنوری ۱۹۳۹ء کو دفتر ادارہ میں موجود تھی) اور وہ سامان جو ضروریاتِ ادارہ کیلئے خریدا گیا تھا ان کے حوالہ کر دیا گیا۔ اس طرح ٹرسٹ سے جملہ حساب بے باق

[1] مکان سے مراد مکان موقوفہ ہے۔ اور غلہ سے مراد زمین وقف کی پیداوار ہے جو ارکانِ ادارہ نے استعمال کی۔ لہٰذا کرایہ مکان اور قیمتِ غلہ کی رقوم دراصل چودھری نیاز علی خاں صاحب کے ٹرسٹ کو ادا کی گئی تھیں اور ٹرسٹ کی طرف سے ادارہ کے بیت المال میں داخل ہوئی تھیں۔

کرنے کے بعد ادارہ کے خزانہ میں صرف ایک سو بتیس روپے باقی ہیں، اور سامان کی صورت میں کچھ موجود نہیں۔

(اس موقع پر مجھے یہ بیان کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ذاتی طور پر میں اور میرا رسالہ ترجمان القرآن کسی شخص یا جماعت کی مالی اعانت کا کبھی شرمندۂ احسان نہیں ہوا۔ میں یہاں اپنے خرچ پر آیا، اپنے خرچ پر رہا اور اپنی شخصی ذمہ داری پر رسالہ چلاتا رہا۔ اس تصریح کی کوئی حاجت نہ تھی اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ بعض حضرات اس باب میں غلط فہمیاں پھیلا رہے ہیں)۔

اس حساب کی رو سے ہم ایک سو بتیس روپے کا عظیم الشان سرمایہ لیے ہوئے دوسرے سال کی سرحد میں داخل ہو رہے ہیں۔ دنیوی لحاظ سے یہ سروسامان بہت حقیر ہے۔ شاید اسے دیکھ کر لوگ ہمارا مذاق اڑائیں گے کہ اس بل بوتے پر آپ کفر کی اُن زبردست طاقتوں کا مقابلہ کرنے چلے ہیں جن کے سرمایہ کو اربوں اور سنکھوں کے حساب سے بھی شمار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اسلام کی تاریخ پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ یہ جب کبھی اٹھا ہے، بے سروسامانی کے ساتھ ہی اٹھا ہے، اور اسی حال میں اس نے بڑی سروسامان والی طاقتوں کے ساتھ ٹکر لی ہے۔ لہٰذا سرمایہ کی قلت وہ چیز نہیں ہے جو ہمارا دل توڑنے والی ہو۔ ہاں! دل توڑنے والی چیز اگر کوئی ہے تو وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے سینوں میں اب وہ دل نظر نہیں آتے جو اسلام کی صحیح کیفیت سے سرشار ہوں۔ کاش، ان سو سو روپوں کے بجائے صرف سوا پیسے ہمارے بیت المال میں ہوتا مگر ہمارے ساتھ مردانِ حق کی ایک ایسی جماعت صف بستہ ہوتی جن کے دل حب الدنیا وکراھیۃ للموت سے خالی ہوتے۔ یہ ہے وہ اصلی سرمایہ جس کے فقدان کا ہمیں افسوس ہے۔ غلط کہتا ہے جو کہتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس دولت نہیں اس لیے یہ کمزور ہیں۔ مسلمانوں میں دولت اب بھی موجود ہے، مگر زیادہ تر ان طبقوں میں ہے جو دو خداؤں کی پوجا کرتے ہیں، مسجد میں خداوندِ عالم کی اور مسجد سے باہر شیطانِ نفس کی۔ اور جن طبقوں میں دولت نہیں ہے ان کے ضعف کا بھی اصلی سبب دولت کا فقدان نہیں بلکہ معبودِ زر کی بندگی ہے جسے راضی کرنے کی فکر ان میں سے بہتوں کو خدا سے بے فکر کر دیتی ہے۔ یہ گھن اس قوم کو سر سے پاؤں تک کھا گیا ہے ورنہ ممکن نہ تھا کہ اس میں حقیقی خدا پرستی زندہ ہوتی اور پھر یہ غلام ہوتی۔

ادارہ دارالاسلام کا دستور العمل شائع ہوئے تقریباً تین مہینے ہو چکے ہیں۔ اس دوران میں ہمارے ارکان کی تعداد پانچ سے بڑھ کر چھ ہو گئی اور خوشی کی بات ہے کہ چھٹی رکن ایک خاتون ہیں۔ ان کے علاوہ حیدرآباد، مدراس، پشاور، دہلی، لاہور اور پٹنہ سے چھ اصحاب نے اپنے آپ کو رکنیت کے لیے پیش کیا ہے لیکن بنا براحتیاط ان کو ابھی آزمائشی دور میں رکھا گیا ہے تاکہ کچھ مدت تک وہ اپنے نفس کا پورا احتساب کریں اور پہلے خود اس امر کا اندازہ کرلیں کہ آیا وہ رکنیت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے اپنے آپ میں پوری طاقت پاتے ہیں یا نہیں۔ معاونین کی فہرست میں بھی چھ اصحاب نے اپنا نام پیش کیا ہے جسے قبول کر لیا گیا کیونکہ رکنیت کی بہ نسبت اس باب میں کم چھان بین کی ضرورت ہے۔

رفتار ترقی کی سستی بجائے مایوس کن ہونے کے ہمارے لیے امید افزا ہے۔ ہمارے پیش نظر تعداد کی کثرت نہیں بلکہ کیفیت کی شدت ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ جن لوگوں تک اس ادارہ کا تخیل پہنچا ہے وہ اس کے وزن کو محسوس کر رہے ہیں، اور انھیں اس امر کا شعور ہے کہ اس ادارہ کی شرکت عام انجمنوں کی شرکت سے مختلف چیز ہے۔ اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ بہت سے وہ لوگ بھی جو ہمارے مقاصد اور طریق کار سے کلی اتفاق رکھتے ہیں، اپنے آپ کو رکنیت یا معاونت کے لیے پیش کرتے ہوئے جھجکتے ہیں، اور جو اقدام کرتے ہیں ان کی محتاط پیش قدمی سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ وہ کسی ہنگامی جوش میں ایسا نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ ان کے گہرے تفکر اور حقیقی شرح صدر کا نتیجہ ہے۔ فطری بات ہے کہ اس صورت میں رفتار ترقی تیز نہیں ہو سکتی، مگر جتنی ترقی بھی ہوگی ان شاء اللہ مستحکم اور پائدار ہوگی۔ اور ہم اپنے آپ کو اس وقت خوش نصیب سمجھیں گے جب اس ٹھنڈی رفتار کے ساتھ ہمیں آٹھ نو کروڑ مسلمانوں کی اس بستی میں سے پچاس مومن قانت مل جائیں گے۔

دوسری طرف بہت سے حضرات نے مراسلات میں بھی اور زبانی گفتگوؤں میں بھی مختلف قسم کے

شبہات کا اظہار کیا جن کا دائرہ اتنے وسیع مباحث پر پھیلا ہوا ہے کہ انھیں سمیٹنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ ان سے ہمیں یہ معلوم کرنے کا اچھا موقع مل گیا کہ اس وقت ہمارے ارباب فکر عموماً کس قسم کی الجھنوں میں مبتلا ہیں، اور ساتھ ہی یہ دیکھ کر اطمینان بھی ہوا کہ اس تمام ذہنی بدنظمی کی تہ میں ایک حقیقی تجسس چھپا ہوا ہے جس کی تشفی کا سامان اگر ہم پہنچ جائے تو ہماری قوم کی یہ ساری قوتیں جو فضول ضائع ہو رہی ہیں، رفتہ رفتہ ایک اجتماعی نصب العین کی طلب میں لگ جائیں گی۔

ہر شبہ کا جواب برسر موقع دیا جاتا رہا ہے لیکن ایک خاص شبہ ایسا بھی ہے جسے مختلف پہلوؤں سے مختلف حضرات نے پیش کیا ہے، اور خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ نسبتہً زیادہ عام ہے۔ لہذا ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ یہاں اسے بیان کر کے صاف کر دیا جائے۔ اس شبہ کا خلاصہ دو سوالوں کی شکل میں بیان کیا جا سکتا ہے:

(۱) تم نے اس ادارہ کو ایک تربیت گاہ یا ایک علمی مرکز کے بجائے ایک تحریک اور وہ بھی آل انڈیا قسم کی تحریک کی صورت دیدی ہے۔ کیا اس سے تمہارا مقصد آل انڈیا انجمنوں میں ایک اور کا اضافہ کرنا ہے؟

(۲) تم نے مسلمانوں کی تمام انجمنوں پر حتی کہ مسلم لیگ پر بھی، جو تم سے نسبتہً قریب تر تھی تنقید کر ڈالی۔ کیا تم اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ چننا چاہتے ہو اور ان سب کے رقیب کی حیثیت سے میدان میں آ رہے ہو؟

ان دونوں سوالوں کا مختصر جواب ہم ایک ہی سلسلہ میں دیں گے۔

یہ گمان کہ ہم کوئی جمہوری یا عمومی تحریک (Mass-movement) لے کر اٹھ رہے ہیں، صرف اسی ایک بات سے بآسانی دور ہو سکتا ہے کہ ہم نے رکن تو درکنار، معاون بننے کے لیے بھی اتنی کڑی قیود رکھی ہیں جو شاید کسی دوسرے ادارہ میں قیادت چلانے کے لیے بھی نہیں ہیں۔ اسی سے اندازہ کر لیا جا سکتا ہے کہ کم از کم مستقبل قریب میں تو یہ ادارہ کوئی عمومی تحریک نہیں بن سکتا۔ اس قسم کا خطرہ جن حضرات کے دل میں گذرا ہے وہ شاید مسلمانوں کی طرف سے بہت ہی خوش گمان واقع ہوئے ہیں کہ اتنی سخت قیود کے باوجود وہ توقع

رکھتے ہیں کہ اس حالت میں اس قوم کے درمیان ایسا ادارہ بھی ایک عمومی ادارہ بن سکتا ہے لیکن اگر فی الواقع ایسا ہو جائے، اگر لاکھوں آدمی دار الاسلام کا نصب العین لے کر اس کیرکٹر کی طاقت کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں جس کا نقشہ ہمارے دستور العمل میں پیش کیا گیا ہے تو یہ گھبرانے کی نہیں، خوشی کی بات ہوگی وہ دن تو اسلام کی فتح کا دن ہوگا جس کی تمنا ہر مسلمان کے دل میں ہونی چاہیے نہ کہ خوف!

دستور العمل سے گذر کر جب آپ ہمارے لائحہ عمل کو دیکھیں گے تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ یہ لائحہ عمل کسی آل انڈیا قسم کی عمومی تحریک کا نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ایک خشک، بے مزہ، سخت محنت طلب اور خاموش تعمیری پروگرام ہے جس کو عمل میں لانے کے لیے اعلیٰ درجہ کی اخلاقی، ذہنی اور عملی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، لگاتار عمل کی ضرورت ہے اور وہ بھی بے مزد و بے اجر، ایثار و قربانی کی ضرورت ہے اور وہ بھی صرف آسائش اور جذباتِ نفس ہی کی حد تک نہیں بلکہ مال اور جان کی حد تک بھی۔ کیا یہ چیز عوام کے مطلب کی ہو سکتی ہے کہ اس کی طرف ان کے فوج در فوج متوجہ ہو جانے کا اندیشہ کیا جا سکے؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم نے اپنے نظام کو ایک مقام پر محدود نہیں رکھا ہے بلکہ ان سب لوگوں کے لیے اس سے وابستہ ہونے کا موقع فراہم کر دیا ہے جو ہمارے ہم خیال ہوں، خواہ ہندوستان کے کسی گوشے میں بیٹھے ہوئے ہوں لیکن اس کا مدعا اس ادارے کو عام اصطلاحی معنوں میں "آل انڈیا" بنانا نہیں ہے بلکہ مقصد کچھ اور ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہندوستان کے ہر کونے میں ایسے لوگ موجود ہیں، جو اسی ایک نصب العین کے لیے جی رہے ہیں جو ہمارے پیش نظر ہے ان میں سے بعض کی قوتیں منتشر سعی و جہد میں ضائع ہو رہی ہیں، اور بعض مایوس بیٹھے ہوئے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ ان سب کو ایک سلک میں منسلک کر دیں تاکہ اس نصب العین کے لیے اجتماعی طاقت فراہم ہو سکے۔ انہی لوگوں میں سے، یا ان کے ذریعہ سے ہم کو اپنے کام کے آدمی مل سکیں گے ورنہ یہاں کس کے پاس اتنا وقت اور اتنا سرمایہ ہے کہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں کام کے آدمی ڈھونڈتا پھرے۔ انہی

لوگوں کے ذریعہ سے ہم اپنے خیالات منظم طریقہ پر پھیلا سکیں گے، اور یہی لوگ آخر کار ان تربیت یافتہ آدمیوں کے لیے میدانِ عمل فراہم کریں گے جنھیں ہمارا ادارہ مختلف تعمیری خدمات کے لیے تیار کرے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام فوائد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک کہ ادارہ کے نظام کو وسیع نہ کیا جائے۔

بلاشبہ مسلمانوں کو ایک ایسی جمہوری تحریک کی بھی ضرورت ہے جو عوام میں بیداری پیدا کرے اور وسیع پیمانے پر منظم جدوجہد کرکے ہندوستان کی اجتماعی زندگی میں مسلمانوں کے لیے ان کی قوم کے شایان شان مرتبہ حاصل کرے۔ جو لوگ اس کام کے لیے موزوں ہیں ان کو یہی کام کرنا چاہیے لیکن اس جمہوری تحریک کی پشت پر ایک ایسی تعمیری تحریک کی بھی ضرورت ہے جو قوم کو بنانے والی حقیقی طاقت فراہم کرے، اور جمہوری حرکت کو حیات اجتماعی کی اصلی غذا بہم پہنچائے۔ صدیوں سے مسلمان اس حقیقت کو بھولے ہوئے ہیں کہ خلافتِ الٰہی کا قیام وہ واحد غرض ہے جس کے لیے ان کو ایک الگ قوم بنایا گیا ہے۔ اسی خود فراموشی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی قومی تحریکیں، اور ان کے کارکنوں کی طاقتیں ایسے مختلف راستوں پر بھٹکتی رہی ہیں اور اب تک بھٹک رہی ہیں جن میں سے کوئی راستہ بھی سیدھا ان کی منزلِ مقصود کی طرف نہیں جاتا۔ لہٰذا کوئی جماعت ایسی بھی ہونی چاہیے جو ان کے سامنے اس نصب العین کو ہر وقت نمایاں اور روشن کرتی رہے، اور ان کی ہر جمہوری حرکت کو اسی کی طرف بڑھنے پر اکسائے اور اگر اس منتہا سے فروتر کسی مقام پر وہ ٹھیر رہے ہوں تو انھیں دھکیل کر آگے بڑھنے پر مجبور کرے۔ پھر وہ اصلی کمزوری جس نے مسلمانوں کو اپنے قومی نصب العین کی طرف پیش قدمی سے درماندہ کر رکھا ہے، یہ ہے کہ صدیوں سے ان کے ہاں اصولِ اسلام کی بنیاد پر تعمیر کا کام بند پڑا ہے، اور بعد کی نسلیں صرف اسی سرمایہ پر زندگی بسر کرتی رہی ہیں جو ابتدائی تین چار صدیوں میں ان کے قومی معماروں نے فراہم کیا تھا۔ یہ سرمایہ اب بالکل ناکافی ہو چکا ہے۔ زندگی کے بدلے ہوئے حالات میں جس جس قسم کے مسائل سے اب وہ دوچار ہو رہے ہیں ان کو کوئی

مفصل، مرتب، قابلِ عمل حل ان کو نہیں ملتا۔ ان کے ہاں عقائد اور اخلاقیات سے لیکر تمدنی، معاشی، سیاسی اور بین الاقوامی قوانین تک ہر چیز ہزار برس پرانی زبان میں ہے جسے اب کوئی نہیں سمجھ سکتا، اور ہزار برس پرانی زندگی سے وابستہ ہے جو آج کہیں موجود نہیں ہے۔ اگرچہ مسلمان اب بھی کبھی کبھی اسلامی حکومت کا نام زبان پر لے آتے ہیں، لیکن اگر کسی خطۂ ارضی میں ان کو حکومت کا موقع مل بھی جائے تو صحیح معنوں میں کوئی اسلامی حکومت قائم نہیں کرسکتے کیونکہ ان کے پاس اس زمانہ کی ضروریات کے مطابق ایک ترقی پذیر نظامِ تمدن و سیاست کو چلانے کے لیے کوئی چیز بھی مرتب نہیں ہے، حتیٰ کہ قرآن و سنت کے اصول و کلیات کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے والے بھی ان میں کہیں شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ترکی و ایران جیسی سلطنتوں کو مجبوراً فرنگی قوانین کی طرف رجوع کرنا پڑا، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں بھی جو لوگ اس وقت اسلام کے نام سے ہماری قومی جمہوری حرکت کو چلا رہے ہیں، وہ غریب صحیح اسلامی اسپرٹ اور صحیح اسلامی اصولوں پر ہمارے قومی مسائل کو حل نہیں کرسکتے۔ پس ہماری ہر جمہوری تحریک کی کامیابی کا، بلکہ ہماری قوم کے مستقبل کا انحصار اس پر ہے کہ ہمارے ہاں ایک جماعت ایسی پیدا ہو جو اس حقیقی ضرورت کو پورا کرے۔ جو ایک ایسا مخزنِ ہدایت ہو جس کی طرف ہر ضرورت کے موقع پر رجوع کیا جاسکے جس میں اتنی زبردست قوتِ محرکہ موجود ہو کہ موجودہ زمانہ کی غیر اسلامی تحریکات کا نہ صرف مقابلہ کرسکے بلکہ افکار کے سیلاب کا رخ اسلامی نصب العین کی طرف پھیر دے، اور مادّی حکومت سے پہلے اسلام کی عقلی و دماغی حکومت قائم کردے۔ خوب یاد رکھنا چاہئے کہ کوئی تہذیب محض سیاسی و فوجی طاقت کے بل پر قائم نہیں ہوسکتی۔ وہ اصلی طاقت جو کسی تہذیب کو قائم کرتی اور قائم رکھتی ہے عقلی و دماغی طاقت ہے۔ تاتاریوں نے تلوار کے زور سے اسلامی ملکوں کا تختہ الٹ دیا، مگر وہ کوئی تہذیبی انقلاب پیدا نہ کرسکے، بلکہ خود ان کی تہذیب سے مغلوب ہوگئی جن کو انھوں نے تلوار کے زور سے مغلوب کیا تھا، اس لیے کہ ان کے پاس عقلی و دماغی حکومت قائم کرنے والی کوئی طاقت نہ تھی۔ لہذا اگر ہمیں سیاسی طاقت حاصل ہو بھی جائے تو ہم اسلام کی حکومت دنیا کے کسی خطہ میں بھی قائم نہیں کرسکتے جب تک کہ ہمارے پاس قرآن کا صحیح فہم نہ ہو، اور اتنی صلاحیت نہ ہو کہ خالص قرآنی بنیادوں پر

کسی تہذیب و تمدن کی عمارت اٹھا سکیں۔

یہی دو کام ہیں جن کے لیے ادارہ دارالاسلام قائم کیا گیا ہے۔ ہمیں اپنے کام اور اس کی نوعیت اور اس کے دائرے کا پورا شعور ہے، اور ہم اپنی تمام کوششوں کو اسی حد کے اندر محدود رکھیں گے جو اس کام کی فطرت چاہتی ہے۔ لہٰذا کسی جماعت کو یہ اندیشہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم ان کے دائرۂ عمل میں مداخلت بیجا کریں گے۔ بلکہ اگر وہ سمجھیں تو انہیں خود محسوس ہو جائے گا کہ ہم ان کے رقیب نہیں بلکہ حقیقی خادم ہیں۔

رہیں مسلمانوں کی وہ مختلف جماعتیں جو اس وقت جمہوری تحریکیں چلا رہی ہیں، تو ہمیں معلوم ہے کہ ان میں سے کون ہمارے راستہ سے قریب تر ہے اور کون بعید تر لیکن ہم نے قصداً کسی خاص جماعت کی تائید و حمایت سے احتراز کیا ہے تاکہ اس جتھے بندی کے دور میں، جبکہ اشخاص اور پارٹیوں کے لیبل ہی حق اور باطل کے معیار بن کر رہ گئے ہیں، ہم کو کسی پارٹی کا نقیب نہ سمجھ لیا جائے۔ ہمارا خطاب عام ہے۔ ہم ہر مسلمان کو اور مسلمانوں کی ہر جماعت کو اس کا وہ نصب العین یاد دلاتے ہیں جو خدا نے اس کے لیے مقرر کیا ہے، اور دلیل کی شہادت سے بتاتے ہیں کہ یہ راستہ تمہیں اس نصب العین کی طرف لے جانے والا ہے اور وہ راستہ اس سے دور ہٹا دینے والا۔ اب جس کے دل میں خدا کی محبت ہوگی وہ اگر غلطی بھی کر رہا ہوگا تو اس سے باز آجائے گا اور خود ہی اس راستے پر چلا جائے گا جو الٰہی نصب العین کی طرف لے جانے والا ہے۔ اور جو اشخاص یا پارٹیوں کی محبت میں گرفتار ہوں گے وہ اپنی ضد پر اڑا رہے گا، اس کی حقیقت آج نہیں تو کل ساری قوم پر کھل جائے گی اور مسلمان بحیثیت مجموعی اس کے فتنے سے بچ جائیں گے۔

اسی طرح تنقید میں بھی ہم نے کبھی کسی کی حمایت یا مخالفت کو مقصود بالذات نہیں بنایا بلکہ ہمیشہ اسلامی نصب العین ہی ہمارا مقصود رہا ہے، اور ہم نے ہر اسلامی جماعت کو اس کی کوتاہیوں پر (خواہ وہ تھوڑی ہوں یا بہت) صرف اس غرض سے متنبہ کیا کہ وہ ان کا تدارک کر کے اس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرنے کی قوت و قابلیت بہم پہنچائے۔ ہر جماعت اور ہر رہنما کو ایسے بہت سے لوگوں کی تائید حاصل ہے جو اس کی غلطیوں اور کمزوریوں پر پردہ ڈالتے اور اس کی غیر مشروط حمایت کرتے ہیں۔ اس تائید پیشہ گروہ میں کسی اضافہ کی حاجت نہیں۔ البتہ ایک ایسے دردمند دوست کی سب کو ضرورت ہے جو انہیں ان کی کوتاہیوں سے باخبر کرے اور اس خدمت کے معاوضہ میں سب سے برا بننے پر راضی ہو۔ ایک نقطۂ نظر سے یہ حماقت ہے کہ آدمی کسی کو اپنا کر کے نہ رکھے۔ مگر دوسرے نقطۂ نظر سے یہ عقلمندی ہے کہ صرف خدا کو اپنا کرے۔

مقالات

دین میں تحریف اور بدعت کے اسباب

از افادات حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

جو صاحب سیاست کبریٰ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا دین لے کر آیا ہو جو تمام ادیان کا ناسخ ہو، اس کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ اپنے دین کو فتنۂ تحریف کی دست برد سے محفوظ کر دے۔ کیونکہ اس کی عام اور ہمہ گیر دعوت مختلف استعداد مختلف مزاج اور مختلف اغراض و مقاصد رکھنے والی جماعتوں کو اپنے جھنڈے کے تلے جمع کرتی ہے۔

ایسا ہوا کرتا ہے کہ لوگ اپنی ہوا پرستی یا اپنے پہلے مذہب کی محبت کی وجہ سے یا مصالح شریعت کا کامل احاطہ نہ کرنے والی فہم نارسا کے اشارہ پر بہت سی منصوص تعلیماتِ شرع کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ اور کبھی اس میں غیر شرعی تخیلات اور تعلیمات ٹھونس دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سارا دین مسخ اور درہم برہم ہو جاتا ہے جیسا کہ بہت سے قدیم مذاہب کی تاریخ گواہ ہے۔ لیکن چونکہ اس فتنہ کے دروازے بے شمار اور ان کی تعداد غیر متعین ہے اور سب کا استقصا ممکن نہیں۔ لہذا شارعؑ کے لئے ضروری تھا کہ امت کو اجمالاً اسبابِ تحریف سے ڈرا کر متنبہ کر دے اور اس کے لئے چند ایسے اصولی مسائل کو مخصوص کرے جن کے بارے میں قیاس کہتا ہے کہ عموماً تہاون اور تحریف کے فتنے بنی نوع انسان میں انہیں راستوں سے گھسا کرتے ہیں، اور ان راستوں کو اچھی طرح بند کر دے۔ اس تہدید و انذار کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی شریعت میں ایسی چیزوں کو داخل کرے جو مسخ شدہ اور باطل مذاہب کے اصولی اور مشہور ترین رسوم و شعائر کے بالکل مخالف

ہوں مثلاً نماز وغیرہ۔ تاکہ کوئی ظاہری تشابہ باقی نہ رہ جائے اور کسی پرانے مذہب کے شعائر سے مداہنت کا امکان باقی نہ رہے۔

تہاون تحریف کے اسباب میں سے ایک تہاون ہے یعنی احکام شرع سے بے پروائی۔ تہاون کی حقیقت یہ ہے کہ رسول کی تربیت یافتہ حواریوں کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہونے لگیں جو نماز کو ضائع کر کے شہوات کی پیروی میں غرق ہوں، علم و عمل اور تعلیم و تعلّم کے ذریعہ دین کی اشاعت کا اہتمام چھوڑ دیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اور اس طرح چند روز بعد مخالف دین رسوم پیدا ہو جائیں اور بحیثیت مجموعی عام طبائع انسانی کا رجحان مزاج شریعت کے خلاف ہو جائے۔ پھر ایسے دوسری خلف آئیں جو شریعت سے بے اعتنائی کے اس جرم میں اور زیادہ آگے بڑھ جائیں یہاں تک کہ علم دین کا اکثر حصہ نسیاً منسیاً ہو کر رہ جائے۔ یوں تو امت کے ہر طبقہ کا تہاون خطرناک اور مضرت رساں ہے مگر جب اس کا صدور رؤسا و اکابر قوم سے ہو تو پھر اس کی مضرتوں کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اسی سبب سے حضرت نوح و ابراہیم علیہما السلام کی شریعتیں برباد ہو گئیں اور آج اس کے اصلی خط و خال کا سراغ لگانا قریباً ناممکن ہو گیا ہے۔

تہاون کے چند اسباب و ذرائع ہیں۔

(۱) پہلا سرچشمہ تہاون کا صاحب شریعت کی روایات کو محفوظ نہ رکھنا اور ان کے مطابق عمل نہ کرنا ہے۔

مندرجہ ذیل ارشاد نبویؐ اسی فتنہ سے باخبر کر رہا ہے:۔

"دیکھو! عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب طعام و شراب سے ایک بدمست انسان اپنے تخت پر بیٹھ کر کہے گا کہ تم اس قرآن کو مضبوط پکڑ لو اور اس میں جس چیز کو حرام پاؤ اسی کو حرام سمجھو اور جس شئے کو حلال پاؤ اسی کو حلال سمجھو۔ حالانکہ خدا کے رسول کی حرام کی ہوئی چیز بھی ویسی

ہی قطعی الحرمت ہے جیسی خود اللہ کی حرام کی ہوئی"۔

اسی بات کو دوسری جگہ یوں فرمایا :۔

"اللہ تعالیٰ لوگوں کے سینوں سے علم نہیں اٹھائے گا بلکہ علماء کو اٹھائے گا اور ان کے اٹھ جانے سے علم اٹھ جائے گا۔ یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہ رہ جائے گا اس وقت لوگ جاہلوں کو امام بنا کر ان کی طرف رجوع کرنے لگیں گے، ان سے مسئلہ پوچھا جائے گا اور وہ بغیر کسی علم و بصیرت کے فتویٰ دیں گے۔ خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمرہی کے جہنم میں ڈال دیں گے"۔

(۲) دوسرا سبب ایسی اغراض فاسدہ ہیں جو من گھڑت تاویلات پر آمادہ کرتی ہیں مثلاً نفس پرست امراء و ملوک کی طلب رضا جس کی وجہ سے انسان اُن کی ہوا پرستیوں کے لئے کلام الٰہی کی غلط تاویلیں کر کے سند جواز مہیا کرتا ہے۔ آیت ذیل ایسے ہی ایمان فروشوں کو مخاطب کرتی ہے :۔

"جو لوگ اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام کو چھپاتے ہیں اور اس کے عوض تھوڑا سا معاوضہ حاصل کرتے ہیں، وہ اور تو کچھ نہیں مگر اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں"۔ (بقرہ۔ رکوع ۲۱)

(۳) تہاون کا تیسرا منبع منکرات اور فواحشات کا امت میں پھیل جانا اور علماء کا ان پر خاموشی اختیار کر لینا ہے۔ اسی حالت کے متعلق قرآن کہتا ہے :۔

"تم سے پہلے گذرنے والی اقوام میں ایسے ارباب خیر کیوں نہ ہوئے جو لوگوں کو ارض الٰہی میں فساد برپا کرنے سے روکتے۔ (ہاں ایسے لوگ تھے تو سہی، مگر بہت کم تھے جنھیں ہم نے عذاب سے بچا لیا۔ رہے ظالم و نافرمان لوگ تو وہ اسی لذت دنیوی میں سرشار رہے جو انہیں دی گئی تھی اور یہ لوگ کچھ تھے ہی بدکردار"۔ (ہود۔ رکوع ۱۰)

بنی اسرائیل کی معصیت پرستی پر تبصرہ کرتے ہوئے آنحضرت صلعم فرماتے ہیں :۔

"ان کے علماء نے انہیں برائیوں سے روکا لیکن وہ نہ رکے۔ پھر علماء ان سے قطع تعلق کرنے کے بجائے ان کی مجلسوں میں اٹھنے بیٹھنے اور ان کے ساتھ کھانے پینے لگے۔ آخرکار اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ایک دوسرے سے مار دیا (یعنی سب کو معصیت کی سیاہی میں رنگ دیا) اور داؤد علیہ السلام و عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کی زبان سے ان پر لعنت کی، کیونکہ وہ خدا کی نافرمانی کرتے اور حد سے بڑھ گئے تھے۔"

تعمق | تحریف کا دوسرا سبب تَعَمُّق ہے یعنی خواہ مخواہ بال کی کھال نکالنا۔ اس کی متعدد صورتیں ہیں۔ مثلاً ۱؎ یہ کہ جب شارع کسی چیز کا حکم دے یا کسی کام سے روکے تو اس کے حکم کو سن کر کوئی شخص اپنے ذہن کے مطابق خود ایک معنی متعین کرے پھر وہی حکم اپنی طرف سے کسی ایسی دوسری چیز پر عائد کر دے جو بعض وجوہ سے پہلی شے کے مشابہ ہو، یا دونوں میں کسی پہلو سے اس کو اشتراک علت نظر آئے۔ ۲؎ یا ایک شے کے حکم کو اس کے تمام اشکال اور مظنات اور اجزاء پر علیحدہ علیحدہ جاری کر دے۔ ۳؎ یا جب کبھی روایات کے تعارض کی وجہ سے اصل حکم اور اس کے صحیح محل و موقع کی تمیز نہ کر سکے تو تمام صورتوں میں سے سخت ترین صورت کو اختیار کر کے اُسے واجب سمجھ لے۔ ۴؎ یا رسول اللہ صلعم کے ہر فعل کو عبادت پر محمول کرے (حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے بہت سے افعال محض عادۃً کے طور پر کئے ہیں، عبادت سے ان کا کوئی تعلق نہیں) اور یہ خیال کر کے کہ یہ تمام امور شریعت کی حیثیت رکھتے ہیں اور امر و نہی کے ذیل میں آتے ہیں، حکم لگا دے کہ خدا نے ان کاموں سے روکا ہے اور ان کاموں کا حکم دیا ہے۔ یہ تمام صورتیں تعمق فی الدین کی ہیں۔ مثال کے طور پر روزہ کے احکام کو لے لو۔ شارع نے جب نفس حیوانی کو مغلوب کرنے کے لئے روزہ رکھنے کا حکم دیا اور اس میں مباشرت سے منع فرمایا تو بعض لوگوں نے سمجھا کہ سحری کھانا بھی خلافِ شرع ہے کیونکہ اس سے روزہ کا مقصد (یعنی نفس کشی) فوت ہو جاتا ہے۔ نیز روزہ دار کے لئے بیوی کا بوسہ لینا بھی ناجائز ہے کیونکہ وہ بھی مباشرت کا داعیہ ہے، بلکہ قضائے شہوت میں ایک طرح مباشرت کے مشابہ ہے۔ رسول اللہ صلعم کو جب ان خیالات کی اطلاع پہنچی تو آپ نے ان کی غلطیوں کو واضح

کرکے فرمایا کہ اس قسم کا قیاس، تحریفِ دین ہے۔

تشدد | تحریف و بدعت کا تیسرا دروازہ تشدد ہے، یعنی ایسی سخت اور شاق عبادتوں کا اختیار کرنا جن کا شارع نے حکم نہیں دیا۔ مثلاً مسلسل روزے رکھنا، ہر وقت نماز و مراقبہ میں مصروف رہنا، تجرد اختیار کرنا سنن و آداب کا واجب اور فرض کی طرح التزام واہتمام کرنا وغیرہ۔ چنانچہ جب حضرت عبداللہ بن عمر اور عثمان ابن مظعون رضی اللہ عنہما نے ایسی ہی سخت ریاضتوں کا ارادہ کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں منع کرتے ہوئے فرمایا کہ "جب کوئی شخص دین کے ساتھ سختی برتے گا اور اپنے نفس کو ناقابل برداشت عبادتوں میں مبتلا کرے گا، تو وہ دین کی پیروی سے عاجز ہو جائے گا۔"

اس تعمق یا تشدد کو اختیار کرنے والا جب کسی گروہ کا امام اور معلم بن جاتا ہے تو اس کے مقلد یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ سارے امور جنھیں ان کا امام بطور عبادت کے سرانجام دے رہا ہے، شرعی احکام ہیں۔ اس طرح یہ تمام چیزیں جزوِ دین خیال کی جانے لگتی ہیں۔ یہود اور عیسائی راہبوں کی یہی وہ خطرناک روش تھی جس نے دین کو تباہ کرکے رکھ دیا۔

استحسان | تیسرا سبب استحسان ہے، یعنی جاہلانہ قیاس آرائی۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص شارع کے طریق تشریع پر نگاہ ڈال کر دیکھتا ہے کہ وہ ہر مصلحت اور حکمت کے لئے ایک مناسب مظنۃ مقرر کرتا اور ہر ایک مقصد کے حصول کے لئے ایک موزوں قالب معین کرتا ہے لیکن چونکہ یہ شخص نگاہِ نبوت کی حقیقت شناسی اور وسعت سے قدرتاً محروم ہوتا ہے اور اسرارِ تشریع کے تمام پہلوؤں کو نہیں دیکھ سکتا، اس لئے وہ ایک آدھ مصلحت کو اچک کر اپنی فہم کے مطابق شریعت کی دفعات بنانے لگتا ہے۔ یہود کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ انھوں نے خیال کیا کہ شارع نے معاصی سے روکنے کے لئے حدود کا حکم محض اس لئے دیا ہے کہ دنیا میں امن قائم ہو اور معاملات درست رہیں۔ پھر انہیں یہ نظر آیا کہ زانی کے لئے جو سزائے رجم شارع نے مقرر کر رکھی ہے اس سے آج کل اختلاف اور جدال و قتال پیدا ہوتا ہے، جو بدترین فساد ہے۔ یہ سوچ کر انھوں نے

رجم کی سزا کو مجرم کا منہ کالا کرنے اور کوڑے مارنے کی سزا سے بدل دینا بہتر سمجھا، اور ایسا کیا بھی۔ رسول اللہ صلعم نے ان کے اس فعل کو تحریف اور ترک احکام الٰہی قرار دیا۔

ابن سیرینؒ سے روایت ہے کہ:۔

"سب سے پہلے ابلیس نے قیاس کیا۔ چاند اور سورج کی پرستش محض قیاس نے کرائی"

امام حسنؒ نے آیت خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ پڑھ کر فرمایا "یہاں ابلیس نے قیاس کیا تھا اور وہ سب سے پہلا قیاس کرنے والا ہے"

امام شعبیؒ سے منقول ہے کہ:۔

"قسم خدا کی اگر تم نے قیاس سے کام لیا تو حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر کے رہو گے"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:۔

"تین چیزیں قصر اسلام کو ڈھا دیں گی، ایک عالم کی لغزش، دوسری منافق کا قرآن سے استدلال تیسری گمراہ ائمہ کے احکام"

یہ تمام باتیں اس قیاس کے متعلق ہیں جس کا سر رشتہ کتاب و سنت سے نہ ہو، بلکہ محض وہمی و عقلی ہو۔

اتباع اجماع فتنۂ تحریف کا چوتھا ذریعہ اتباع اجماع ہے۔ اجماع سے مراد یہ ہے کہ حاملین شریعت کا ایک گروہ، جس کی اصابت رائے پر عام لوگوں کو اعتقاد ہو، کسی چیز پر اتفاق کرلے اور لوگ سمجھیں کہ مجرد یہ اتفاق ہی حجت شرعی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس قسم کا اتباع اجماع اسوقت تحریف دین کے مترادف ہو جاتا ہے جب اس اجماع کی اصل کتاب و سنت میں موجود نہ ہو۔ اور یہ وہ اجماع نہیں ہے جس کے حجت ہونے پر امت کا اتفاق ہے۔ کیونکہ امت کا اتفاق تو اسی اجماع کے اتباع پر ہے جس کی سند کتاب و سنت میں موجود ہو یا جو کتاب و سنت سے مستنبط ہو۔ رہا وہ اجماع جس کی اصل نہ قرآن میں ہو نہ حدیث میں، سو اس کو کسی نے بھی حجت نہیں مانا۔ بلکہ اس کے اتباع کی مذمت میں تو قرآن کہتا ہے کہ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ آمِنُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا

عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا۔ جب ان سے کہا گیا کہ ایمان لاؤ اس چیز پر جو خدا نے اتاری ہے تو انھوں نے کہدیا کہ ہم تو اس طریقہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا"۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے انکار میں یہود نے جو دلیل پیش کی تھی وہ اسی اتباعِ اجماع پر مبنی تھی۔ ان کے اسلاف نے بزعمِ خود ان انبیائے صادقین کے حالات کا تفحص کیا اور انہیں نبوت کے معیار پر نہ پایا، لہٰذا ان کا انکار ہمیشہ کے لئے ایک برہانِ قاطع بن گیا۔ نصاریٰ کے اندر بھی اسی اتباعِ اجماع نے بے شمار گمراہیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ ان میں توراۃ و انجیل کے خلاف اور ان کے احکام سے زائد صدہا باتیں شریعت کی حیثیت سے موجود ہیں، جن کے بارے میں ان کے پاس "اجماعِ سلف" کے سوا اور کوئی دلیل نہیں۔

تقلید | پانچواں سرچشمہ جہاں سے تحریفِ دین کا سیلاب پھوٹتا ہے کسی غیر معصوم (غیر نبی) انسان کی کورانہ تقلید ہے یعنی کوئی عالمِ دین کسی مسئلہ میں اجتہاد کرے اور اس کے مقلدین بغیر دلیل و حجت محض حسنِ ظن کی بنا پر یہ خیال کرلیں کہ امام کا اجتہاد قطعاً یا غالباً صحیح ہے، پھر اس خیال کے ماتحت کسی صحیح حدیث کو اس کے اجتہاد سے رد کر دیں۔ یہ تقلید وہ تقلید نہیں ہے جس کے جواز پر امتِ مرحومہ کا اتفاق ہے۔ امت نے مجتہدین کی تقلید کے جواز پر جو اتفاق کیا ہے وہ چند قیود کے ساتھ ہے۔ اولاً آدمی کو یہ علم و اعتقاد رکھنا چاہئے کہ مجتہد معصوم نہیں ہے، اس کا اجتہاد صحیح بھی ہوتا ہے اور غلط بھی۔ ثانیاً اسے ہمہ وقت ارشادِ نبوی کی تلاش میں اس عزم کے ساتھ لگا رہنا چاہئے کہ جب کبھی کوئی صحیح حدیث اجتہادِ امام کے خلاف مل جائے گی تو وہ امام کی تقلید اس مسئلہ میں ترک کر دے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے متعلق فرمایا کہ یہود اپنے علماء و مشائخ کی پرستش نہیں کرتے تھے بلکہ کرتے یہ تھے کہ جس چیز کو یہ لوگ حلال کہہ دیتے اسے وہ بغیر کسی حجتِ شرعی کے حلال سمجھ لیتے تھے اور جسے یہ حرام کہہ دیتے اسے حرام سمجھ لیتے تھے۔

خلط مذاہب | دین کے اندر فتنۂ تحریف کے گھسنے کا چھٹا راستہ مختلف مذاہب اور شرائع کا باہم اس

طرح خلط ملط کر دیتا ہے کہ ایک دوسرے سے تمیز نہ ہو سکے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک آدمی پہلے کسی اور مذہب کا پیرو رہتا ہے اور اس کے دل و دماغ پر اپنی سابق مذہبی سوسائٹی کے علوم و نظریات پوری طرح حاوی ہوتے ہیں۔ پھر وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوتا ہے لیکن قلب میں اُن پرانی نقوش کا اثر باقی رہتا ہے، انجام کار یہاں بھی وہ ان علوم و نظریات کی توقیر و قبولیت چاہتا ہے خواہ وہ بجائے خود کیسے ہی بے جان اور بے اصل ہوں۔ حتیٰ کہ بسا اوقات وہ اس کے لئے روایتیں گھڑنے پر اتر آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "بنی اسرائیل برابر راہِ اعتدال پر قائم رہے یہاں تک کہ ان میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جو خالص اسرائیلی نہ تھے (باپ اسرائیلی تھا اور ماں دوسری قوم سے) یعنی لونڈی زادے تھے۔ ان لوگوں نے دین میں رائے کو دخل دیا نتیجہ یہ ہوا کہ خود گمراہ ہوئے اوروں کو بھی گمراہ کر دیا"۔ چنانچہ خود ہمارے دین میں بھی آج بے شمار علوم اسی نوع کے داخل ہو چکے ہیں مثلاً اسرائیلی علوم، خطبا، جاہلیت کے اقوال، یونان کا فلسفہ، ایران کی تاریخ، علم نجوم، رمل اور علم کلام وغیرہ۔ رسول اللہ صلعم کے حضور میں جب توراۃ پڑھی گئی تو آپ بہت خفا ہوئے، اس خفگی میں یہی راز تھا۔ نیز کتاب دانیالؑ کے طالب کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی وجہ سے سزا دی تھی۔ (ماخوذ از حجۃ اللہ البالغہ)

دلائل السنن والآثار

از

جناب مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی

(۱)

جس طرح آج کل موجودہ سیاسی کشمکش مسلمانوں کے لئے انتہائی صبر آزما اور فتنے کا باعث ہے اسی طرح اہل علم اور مسلمانوں کے لئے دو اور فتنے سخت ہیں۔ ایک "تکفیر و تفسیق"۔ دوسرا "انکار حجیت حدیث"۔ اول الذکر کے متعلق ایک مضمون بعنوان "کفر و ایمان" رسالہ ترجمان القرآن ماہ شوال ۱۳۵۵ھ میں احتیاط و ذمہ داری سے شائع ہو چکا ہے جس میں اہل علم کی تحقیقات جو تمام تر کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں پیش کر دی گئی ہیں۔ اب موخر الذکر پر اصولی حیثیت سے گفتگو کی جاتی ہے۔ شاید میری یہ کاوش خدا کے نزدیک شرف قبول حاصل کرے اور لوگوں کے لئے مفید ثابت ہو وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ طالب حقیقت کے لئے ہر ہر قدم پر دو مشکلیں پیش آتی ہیں۔ ایک طرف تو یہ کہ وہ کسی مسئلہ کو محض اسلئے کہ فلاں شخص نے کہا ہے صحیح نہیں مانتا بلکہ بڑے سے بڑے عالم کی رائے کا غلط ہونا ممکن سمجھتا ہے دوسری طرف ائمہ کی رایوں کو بغیر کامل غور کے غلط سمجھنا خود نہایت خطرناک ہے۔ جس مسئلہ میں کسی امام نے غلطی کی ہے اس میں طالب حقیقت بھی ممکن ہے کہ غلطی کر جائے اور سب سے بڑی غلطی یہ ہوگی کہ صحیح رائے موجود ہونے کے ساتھ اس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے غلطی میں پڑے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ چراغ ہوتے ہوئے آدمی اپنی غفلت سے ٹھوکر کھائے۔ حضرت امام غزالیؒ کا یہ قول کس قدر ٹھیک اور نصیحت بخش ہے کہ جس نے شک نہیں کیا وہ تحقیق

نہیں کرے گا اور جو تحقیق نہیں کرے گا وہ ہمیشہ اندھا رہے گا۔ اسی اندھے پن کے دور ہونے کا نام بصیرت، یقین، ایمان، ایقان، کشف غطا، اطمینانِ قلب اور ثلج صدر و علم و معرفت ہے۔ بلاشبہ شک کی تہ میں دو چیزیں ہیں جو تحقیق کی بنیاد ہیں، جہل اور اس کی ناگواری۔ جب انسان اپنے تقلیدی علم کی بے حقیقتی کو سمجھتا ہے تو وہ علم اس کو جہل معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے علم کو علم نہیں سمجھتا، اور جب اس پر یہ حالت پوری طرح طاری ہو جاتی ہے تو طبیعت فطرتاً علم کی خواہش مند ہوتی ہے۔ پس طالب حقیقت کو ایک طرف آزادی اور دوسری طرف وقعت رائے سلف کا خیال رکھ کر قدم رکھنا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ دونوں پہلو مخالف یکدیگر ہیں لہٰذا اگر ایک طرف اس نے زیادتی کی تو دوسری طرف کمی کر دے گا۔ ایسے ہی خیال کا اثر تھا اس شخص پر جس نے یہ کہا ہے کہ ؎

مراد خضر عناں گیر باید از چپ و راست ‍ ‍ ‍ ‍ که کجروی نه کنم ورنه عزم راهِ خطا است

پس کسی حکیم و امام کی ایسی رائے کے متعلق جو بادی النظر میں غلط معلوم ہوتی ہو زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہے اور سخت احتیاط درکار ہے۔ بالخصوص ایسے مسائل میں جو معرکۃ الآراء رہے ہیں، ورنہ طالب حق سلف سے فائدہ نہیں اٹھا سکے گا اور آزادی اس کو اس سے زیادہ سطحی بنا دے گی جتنا تقلید سے ڈر ہے۔ ممکن ہے کہ اس آزادی اور حریت بلکہ نام نہاد تحقیق کے زمانہ میں کسی کو "وقعت رائے سلف" کے جملہ سے اختلاف ہو سو اس کو قرآن حکیم میں سورہ حشر کی دسویں آیت وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ الخ پر غور کرنا چاہئے جس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ جو مہاجرین و انصار کے بعد عالم وجود میں آئے وہ سابقین کے لئے دعاء مغفرت کرتے ہیں اور کسی مسلمان بھائی کی طرف سے دل میں عداوت اور بغض نہیں رکھتے بلکہ ظنوا المومنین خیرا پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

لیکن آج یہ عالم ہے کہ بلا سوچے سمجھے سب سے پہلے سلف کی خدمات اور ان کی جد و جہد او ر ناقابل انکار

ومجیر العقول علمی وعملی کارناموں پر تیشہ چلا دیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک یہ وبا دو طرح سے پھیلی۔ ایک تعلیم قرآن کی کمی، احادیث نبوی سے بے اعتنائی اور ان کے تراجم کی کثرت۔ دوسرے ایک محدود نصاب تعلیم اور انگریزی تمدن تہذیب کی تقلید وغیرہ۔ یقیناً مترجمین کی نیتیں صالح اور مقاصد نیک تھے لیکن اس کا دوسرا رخ نہایت خطرناک تھا جس کا تجربہ ومشاہدہ آج ہر ہر قدم پر ہو رہا ہے۔ ہاں یہ بات خیال میں رکھنی چاہئے کہ مروجہ نصاب تعلیم جس میں زیادہ تر جماعتی عصبیت کے ماتحت تعلیم دی جاتی ہے اس سے نہ تو تحقیق کا دروازہ کھل سکتا ہے اور نہ اجتہاد و تفقہ فی الدین کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہی ہوتا تو پھر حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کو ۸ سال تک صرف سورۂ بقرہ کے حقائق ومعارف بارگاہ رسالت میں نہ حل کرنے پڑتے، نہ حضرت مجاہد بن جبیرؒ کو تین بار تفسیر قرآن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے پڑھنے کی نوبت آتی، نہ ابو محمد عبد اللہ بن عطیۃ الدمشقی المتوفی ۳۸۳ھ کو قرآن کے افہام وتفہیم کیلئے ۵۰ ہزار اشعار حفظ کرنے پڑتے، اور نہ امام ابن تیمیہؒ کو ایک ایک آیت قرآن پر سو سو تفسیریں دیکھنی پڑتیں اور پھر متروک وغیر آباد مسجد میں جاکر بارگاہ رب العزت میں "یارب ابراہیم[۱] فہمنی" کی دعائیں مانگنی پڑتیں اور اس وقت تک یہ مشغلہ جاری رہتا جب تک کہ شرح صدر نصیب نہ ہوجاتا، نہ حضرت شاہ عبد القادرؒ کو ۴۰ سال مسجد میں معتکف رہ کر درس وتدریس کلام الٰہی میں بسر کردینے کی ضرورت تھی، نہ استاذ امام علامہ فراہیؒ کو ۳۰-۴۰ سال اس لیلائے مقصود کی طلب میں دل ودماغ کو محو کردینا پڑتا۔

بلاریب وسائل وذرائع اور علوم الٰہیہ کی تحصیل کے بعد افہام وتفہیم کلام الٰہی کا واحد ذریعہ اگر کوئی چیز ہے تو وہ تزکیۂ نفس اور فیضان الٰہی ہے۔ اسی حقیقت کی جانب حضرت علامہ اقبالؒ اشارہ فرماتے ہیں: —

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب   گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

آنحضرت صلعم کی صفت قرآن نے جا بجا یہ بیان کی ہے، یَتْلُوا عَلَیْهِمْ آیَاتِهِ وَیُزَکِّیهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ۔ یہ تلاوت آیات، تزکیۂ نفس اور تعلیم کتاب وحکمت پر بھی کبھی غور

[۱] الرد الوافر

کیا گیا ہے؟ اس کا جواب خود شمع نبوت کے پروانوں کی زبانوں سے سنیئے۔

حرف از زبان دوست شنیدن چہ خوش بود یا از زبان آنکہ شنید از زبانِ دوست

حضرت ابو عبدالرحمن اسلمیؓ صحابہ کرام کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلعم سے قرآنِ مجید کی دس دس آیات پڑھا کرتے تھے۔ الفاظ کے ساتھ عمل کا طریقہ بھی سیکھتے جاتے۔ جب ہم قرآن کا ایک حصہ ختم کرتے تو الفاظ و معانی کے ساتھ اس کے طریق عمل سے بھی واقف ہوتے جاتے[1]۔ حضرت عمر بن الخطابؓ فرماتے تھے کاش میں تین باتوں کی بابت تفصیلی معلومات آپ سے حاصل کر لیتا کہ آپ ہمیں فیصلہ کن معلومات دیتے۔ دادا کی میراث کا مسئلہ، کلالہ اور چند سائل ربوا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں خدا کی قسم قرآن کی کوئی سورت ایسی نہیں جس کے متعلق مجھے یہ علم نہ ہو کہ کہاں اتری اور کس کے متعلق۔ اگر مجھے یہ علم ہو جائے کہ مجھ سے زیادہ کسی کو قرآن کا علم ہے اور سواری وہاں تک پہنچ سکے تو یقیناً اس کے پاس جا کر علم قرآن حاصل کروں۔ تمام صحابہ اس سے بخوبی واقف ہیں کہ میں سب سے قرآن کی بابت زیادہ واقف ہوں حالانکہ میں سب سے بہتر نہیں ہوں[2]۔ حبرالامۃ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے متعلق تو پوچھنا نہیں کیونکہ یہاں تو ملکوتی تائید "اللھم علمہ الکتاب" حاصل تھی۔ ان واقعات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کا ادعاءِ علمِ قرآن اس دریا کے مقابل قطرہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلاشبہ آج وسائل و ذرائع کی فراوانی ہے تحصیلِ علوم و فنون کے لئے جو دشواریاں اگلوں کو تھیں وہ اب باقی نہیں رہیں۔ تاہم بارگاہِ رسالت سے بواسطہ و بلاواسطہ فیض پانے والوں کی ہمسری کا دعویٰ کون کر سکتا ہے؟ کہ یہاں تو فانھم ابر ھذہ الامۃ قلوبا واعمقھا علما واقلھا تکلفا۔ اور شہداءَ اللہ علی الناس کی سند حاصل ہو چکی تھی۔

بہت ممکن ہے کہ کسی کو میری اس بات سے یہ گمان ہو کہ میں تفسیر کی ہر اس روایت کو صحیح سمجھتا ہوں جو بطریق حدثنا و اخبرنا ابن جریر و درمنثور وغیرہ میں موجود ہے۔ سو میرا یہ خیال ہرگز نہیں ہے، اور یہ بھی

[1] ابن جریر [2] بخاری و مسلم

نہیں ہے کہ تمام کو ترک کرکے، خود ساختہ اصول کے ماتحت قرآن حکیم کے افہام وتفہیم کے صدہا حقائق و معارف کو چھوڑ کر سلف کے طریق تفسیر کو بے معنی یقین کرلوں۔ کیونکہ مجھے علم ہے کہ تفسیری روایتوں میں سب سے زیادہ کمزور اور بعو طریق تفسیر کلبی ابو نصر محمد بن سائب کا ہے اور اگر محمد بن مروان سدی صغیر کی روایت کو شامل کرلیا جائے تو یہ سلسلہ پورا کا پورا سلسلۂ کذب بن جاتا ہے۔ اسی طرح طریق مقاتل بن سلیمان ازدی اور ضحاک بھی منقطع ہے۔ بے شک طریق قیس بن مسلم کوفی جو عطا بن سائب سے روایت کرتے ہیں اور طریق ابن اسحٰق جید اور صحیح ہیں۔ صحابہ میں جن سے تفسیری روایتیں کم ہیں وہ انس بن مالک رض، ابو ہریرہ رض، عبداللہ بن عمر رض، جابر بن عبداللہ رض، ابو موسیٰ اشعری رض، عبداللہ بن عمرو بن العاص رض، زید بن ثابت کاتب وحی رض، ہیں۔ تابعین میں اصحاب عبداللہ بن عباس یعنی علمائے مکہ مکرمہ ہیں جن میں مجاہد بن جبیر المتوفی ۱۰۳ھ کی تفسیر پر امام شافعی اور امام بخاری وغیرہ نے اعتماد کیا ہے۔ علامہ ابن جوزی رح اور سیوطی رح وغیرہ نے طبقات مفسرین میں حقیقت بالا کا ذکر کیا ہے جس سے میرے بیان کی تائید ہوتی ہے جو اہل علم پر مخفی نہیں۔

قرآن حکیم نے مختلف مقامات پر تدبر و تفکر کی جو ترغیب دلائی ہے سو اس کا یہ مقصد نہیں کہ علوم الٰہیہ اور سنن نبویہ، و اشارات سلف کو ترک کرتے ہوئے حسبنا کتاب اللہ کی آڑ میں اپنے اہواء و خواہشات کے ماتحت قرآن کی تفسیر شروع کردی جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہدایت کے بجائے ضلالت کی نشر و اشاعت ہوگی اور شاید اسی لئے قرآن نے بھی يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور شارع علیہ السلام نے اس کی تشریح من قال فی القرآن برأیہ الخ سے فرما کر ہمیشہ کے لئے اس خطرہ کا سد باب کردیا ہے۔

مجھے اس وقت اصول تاویل پر گفتگو کرنی نہیں ہے تفصیل کے لئے فوز الکبیر وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے۔ مختصراً یہ مد نظر رکھنا چاہئے کہ قرآن کی تفسیر جہاں تک ممکن ہو قرآن کی دوسری آیات سے کرنی چاہئے۔ پھر نظم کلام، سیاق و سباق آیات، شواہد کلام عرب، سنن و آثار نبویہ، اور طریق تفسیر اصحاب رسول اللہ صلعم

کے ماتحت مفہوم کلام الٰہی کا سراغ لگایا جائے۔ اور قرآن حکیم کو اصل قرار دیتے ہوئے تاریخی شواہد کے لئے اگر اسفار یہود سے بھی مدد لی جائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔ بہرحال ان سب میں مقدم ترین اصول تحصیل زبان عربی کے ساتھ ساتھ تزکیہ نفس اور تدبر و تفکر آیات انفس و آفاق ہے جس کے بغیر نحو و بلاغت قرآن اور روح و اسرار کلام الٰہی سمجھنا دشوار ہے۔

سلسلہ خلافِ امید دراز ہو گیا اور بات سے بات نکل آئی۔ یہاں مجھے جس چیز پر کسی قدر مفصل کلام کرنا ہے وہ سنن و آثار نبوی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہیں۔ اگرچہ ائمہ سلف اور علمائے دور حاضر نے اس کے اصول و قوانین، نوعیت و حیثیت اور حجت دینی ہونے یا نہ ہونے پر کافی سے زیادہ بحثیں فرمائی ہیں اور داد تحقیق دی ہے جو اپنی جگہ پر براہین قاطعہ ہیں لیکن افسوس مخالفین نے سطحی معلومات سے کام لے کر عوام میں سنن و آثار نبوی سے بدظنی پیدا کر ہی دی جو تمام تر غلط فہمی و قلتِ مطالعہ پر مبنی ہے، ورنہ اصول حدیث کے مالہ و ماعلیہ کے سمجھ لینے کے بعد وہ جرأت نہیں ہو سکتی جو موجودہ عہد تحقیق میں کی جا رہی ہے۔ یہ ناچیز کوئی نئی بات نہیں پیش کرے گا بلکہ اہل علم کی ان تحقیقات کو سامنے لائے گا جو معرض خفا میں ہیں، تاکہ فیصلہ کرنے میں حق و باطل کی تمیز ہو سکے۔ السعی منی والاتمام من اللہ تعالیٰ۔

اصول حدیث یہ ایک تاریخی بات ہے کہ حضرت امام شافعی نے سب سے پہلے اصول فقہ میں ایک رسالہ لکھا اور اصول حدیث میں ابتداً قاضی ابو محمد رامہرمزی اور حاکم ابو عبداللہ نیشاپوری نے کی۔ پھر تو یہ قطرہ دریا بن گیا۔ مگر ان سب کا ماخذ قرآن کریم اور سنن و آثار نبوی ہی تھے جس کو غلطی سے آج کچھ اور ہی سمجھ لیا گیا ہے۔ سب سے بڑی خصوصیت اس فن کو یہ حاصل ہے کہ اس کے اندر اجتہاد، ظن اور تخمین کو قطعاً باریابی نہیں بلکہ یا تو مشاہدات ہیں یا مسموعات وغیرہ۔ تفصیلی بحث آگے آئے گی جس سے معلوم ہو گا کہ محدثین الفاظ جرح و تعدیل جو کچھ بیان فرماتے ہیں سب کی بنیاد محسوس مشاہدہ اور کسی نصی امر پر ہے نہ کہ رائے و قیاس پر۔ ثبوت میں ذیل کے شواہد کو بغور ملاحظہ کیا جائے کہ یہی اصول حدیث کی

اساس اور بنیاد ہیں۔

(۱) یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْا الخ

لفظ فسق باصطلاح قرآن متعدد معنوں میں مستعمل ہے۔ آیات ذیل پر غور کیا جائے: اَفَمَنْ کَانَ مُؤْمِنًا کَمَنْ کَانَ فَاسِقًا۔ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّہٖ۔ فَفَسَقُوْا فِیْھَا۔ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِیْنَ۔ وَلَا تَقْبَلُوْا لَھُمْ شَھَادَةً اَبَدًا وَّاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ۔ اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّہٗ فُسُوْقٌ بِکُمْ۔ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ۔

احادیث میں بھی یہ لفظ آیا ہے۔ سباب المؤمن فسوق۔ اقتلوا الفویسقة۔ لا یرمی رجل رجلا بالفسق او الکفر۔ اہل عرب کا قول ہے "فسق الرطب اذا خرج عن قشرہ" یعنی خرمے کا چھلکے سے علیحدہ ہو جانا چنانچہ ابن الاعرابی کہتا ہے کہ "فاسق کا لفظ انسان کی صفت میں کلام عرب میں نہیں پایا جاتا ہے"۔ بہرحال ارباب لغت وغیرہ نے "فسق فلان خرج عن حجر الشرع" "الترک لامر اللہ" "الخروج عن طریق الحق" "من یستر نعمة اللہ فقد خرج عن طاعتہ" وغیرہ کے الفاظ جو استعمال فرمائے ہیں اس کی اصلیت کلام عرب اور لفظ کے اصلی معنی سے ماخوذ ہے۔ رہ گیا مفہوم آیت اِنْ جَآءَکُمْ الخ سو وہ یہ ہے کہ اکثر نزاعات ومناقشات کی ابتدا جھوٹی خبروں سے ہوتی ہے اس لئے اول اختلاف وتفریق کے اسی سرچشمہ کو بند کرنے کی تعلیم دی یعنی کسی خبر کو یوں ہی بے تحقیق قبول نہ کرنا چاہئے۔ امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں اس آیت کو بھی ذکر فرما کر یہ عبارت تحریر فرمائی ہے: فدل بما ذکرنا من ھذہ الای ان خبر الفاسق ساقط غیر مقبول وان شھادة غیر العدل مردودة۔ مفہوم اضح ہے۔ مگر حافظ ابن تیمیہؒ کی تقریر ذیل پڑھ کر تھوڑی سی الجھن بڑھ گئی "نبأ الفاسق لیس بمادو

.... وانما امر بالتبیین عند خبر الفاسق الواحد ولم یامر بہ عند خبر الفاسقین وذالك ان خبر الاثنین یوجب من الاعتقاد مالا یوجب خبر الواحد الخ (توجیہ النظر صفحہ ۲۹)

بظاہر یہ تقریر قدماء محدثین کے خلاف ہے۔ غالبًا اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ آیت اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ الخ کی تاویل علامہ موصوف کے نزدیک اور ہے اور محدثین کے نزدیک اور۔ خیر امام ابن تیمیہؒ کا جو بھی منشا ہو میرے نزدیک صحیح توجیہ یہ ہے کہ خبر فاسق نقل روایت حدیث میں سرے سے غیر مقبول ہے چاہے سامع کے دل میں اس کی صداقت پیدا ہو یا نہ ہو۔ وجہ یہ ہے کہ خبر تو محض ترجیح صدق ہی کی بنا پر حجت ہوتی ہے بخلاف فسق کے کہ اس سے ترجیح صدق کا قلع قمع ہو جاتا ہے اور کذب ہی کا پہلو راجح قرار پاتا ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ جب عقل اور دین نے اس کو ارتکاب گناہ سے باز نہیں رکھا تو پھر جھوٹ سے کیسے بچ سکتا ہے۔ بدیں وجہ فاسق کی خبر قطعاً حجت نہ ہونی چاہئے۔ ہاں اگر وہ حلت و حرمت طعام یا پانی کی نجاست و عدم نجاست کی خبر دے تو اس وقت قبول ہو گی جبکہ اس کی تائید زبردست رائے سے ہوتی ہو۔ وجہ یہ ہے کہ حلت و حرمت، نجاست و طہارت ایک امر خاص ہے بمقابل روایت حدیث کے، کیونکہ خبر کے متعلق بااوقات ایسی دشواریاں لاحق ہوتی ہیں کہ اس پر وقوف و اطلاع پانا متعذر ہوتا ہے۔ اسی لئے جب تک دوسرے قرائن اور شواہد سے تائید نہ ہو قبول نہیں کی جا سکتی وغیرہ وغیرہ۔ اور روایت حدیث میں اس کی ضرورت نہیں کیونکہ یہاں تو عادل اور ثقہ نے تلقی اور نقل اخبار ایسے لوگوں سے کی ہے جن کو معرفت حدیث پر سماعًا پوری اطلاع حاصل ہے لہذا ان کو فاسق کی خبر پر اعتماد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس تقریر سے یہ واضح ہو گیا کہ عام خبریں اور شہادتیں دوسری چیز ہیں اور روایت حدیث امر دیگر۔ لہذا علامہ موصوف کی تقریر کو ان امور و اخبار پر محمول کیا جائے گا جن کا روایت حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

روایت اور شہادت کا فرق اس موقع پر روایت اور شہادت کے فرق کو سمجھ لینا چاہئے جس سے صدہا مشکلات

کا حل ہوجاتا ہے اور جس میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے بہتوں نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ علامہ سیوطیؒ نے تدریب میں مفصلاً اور حافظ ابن قیمؒ نے بدائع الفوائد میں مجملاً بحثیں کرکے شہادت اور روایت کے فرق کو واضح کیا ہے۔ اصل کتاب کی جانب رجوع کرنا چاہئے۔ مباحث علم حدیث کے سمجھنے کے لئے چند اصولی فروق کو یہاں لکھا جاتا ہے:۔

روایت نام ہے عام لوگوں کو خبر دینے کا کہ جس کا مرافعہ حکام کی طرف نہ کیا جاسکے۔ بخلاف شہادت کے کہ اس میں یہ بات نہیں ہوتی اور اسی بنا پر احکامات میں آگے چل کر اختلاف ہوجاتا ہے۔ اسی طرح روایت میں عدد شرط نہیں ہے اور شہادت میں یہ بحث پیدا ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سواد امت آنحضرت صلعم پر کبھی جھوٹ کی نسبت نہیں کرسکتی کیونکہ اسے ہر طرح کا خوف اور خطرہ ہے جو دارین کی ہلاکت اور تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ بخلاف شہادت کے کہ دن دھاڑے جھوٹی گواہی لوگ دیتے رہتے ہیں[۱]۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ کبھی راوی منفرد ہوتا ہے۔ اگر ایسی حالت میں روایت قبول نہ کی جائے تو اہل اسلام کی صد ہا مصلحتیں فوت ہوجائیں بمقابل اس بات کے کہ ایک شخص کا حق ایک شخص کی وجہ سے ضائع ہوجائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔ نیز یہ وجہ بھی ہے کہ لوگوں میں باہم عداوتوں کی بنا پر جھوٹی گواہی دینے کا جذبہ پیدا ہوتا رہتا ہے نہ کہ آنحضرت صلعم سے جھوٹ روایت کرنا وغیرہ۔ روایت میں ذکوریت شرط نہیں ہے بخلاف شہادت کے کہ اس میں

---

[۱] ترجمان القرآن۔ یہ حجت محل نظر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ امت کا سواد اعظم نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان باندھنے کا خیال بھی نہیں کرسکتا۔ مگر احاد امت نے ایسا کیا ہے اور امت نے اکثر دھوکا بھی کھایا ہے۔ اعداء دین نے تو خیر قصداً شرارت کی نیت سے حدیثیں گھڑیں، مگر کیا واعظوں اور زاہدوں نے موضوعات اور ضعاف کو تکیۂ کلام نہیں بنایا؟ اور کیا ان حضرات کے اعتماد پر غیر معتبر روایتیں عامۃ الناس کے زبان زد نہیں ہوئیں؟ اسی بنا پر تو محدثین نے روایات کی چھان بین میں اس سے زیادہ سختی کی ہے جس قدر قانون شہادت کی رو سے قاضی کرتا ہے۔ اور اسی بنا پر اخبار احاد کا حدیث میں وہ درجہ نہیں جو مشہورات کا ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ خبر واحد کو محض خبر واحد ہونے کی وجہ سے رد نہیں کردیا گیا، بلکہ راویوں کے احوال اور سلسلۂ اسناد کی کیفیت کو دیکھ کر رائے قائم کی گئی ہے جو سراسر معقول ہے۔

بعض مواقع میں ذکوریت شرط ہے۔ اسی طرح جھوٹ سے توبہ کرنے والے کی شہادت مقبول ہے لیکن روایت غیر مقبول۔ اگر کوئی ایک روایت میں جھوٹا ثابت ہوگیا تو اس کی جمیع روایات غیر مقبول ہو جاتی ہیں۔ بخلاف شہادت کے کہ اگر ایک مرتبہ جھوٹی معلوم ہو جائے تو اس سے پہلے کی شہادتیں رد نہیں کی جائیں۔ اہل علم پر مخفی نہیں کہ صحیح مذہب کی بنا پر تنہا ایک شخص کی جرح وتعدیل روایت میں معتبر ہو جاتی ہے نہ کہ شہادت اور گواہی۔ غور کرو اگر کسی نے روایت کی اور پھر اس سے رجوع کرلیا تو روایت اور عمل دونوں ساقط ہو جائیں گے۔ شہادت میں یہ بات نہیں ہوتی ہے۔ یہاں تو حکم کے بعد رجوع کر ہی نہیں سکتا۔ اس فرق کو سمجھو تاکہ فنِ حدیث کی اہمیت کا اندازہ ہو اور آنے والے مباحث کے پیچ وخم ایک ایک کرکے واضح ہو جائیں۔

(۲) يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ۔ وَاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ۔ لفظ عدل کی لغوی تحقیق طویل ہے۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ مختلف مقامات پر بیان ہوا ہے۔ سورۂ مائدہ کی ایک آیت میں یہ لفظ دو جگہ موجود ہے۔ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا الخ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عبادات ہوں خواہ معاملات، اخلاقیات ہوں خواہ سیاسیات، مذہب سب کا ضامن اور قرآن مہیمن ہے۔ قرآن کریم کا یہ حکم ہے کہ تم میں سے وہ لوگ ایسے امور میں فیصلہ کریں جو صاحب بصیرت، معتبر، اور تجربہ کار ہوں کیونکہ یہ چیزیں ایسی ہیں جن سے ایک شخص کے کیرکٹر کی بلندی، صداقت اور اس کے عادل ہونے کی شہادت دی جاسکتی ہے، جو عند اللہ معتبر ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ عند الناس معتبر نہ ہو۔ ہاں بعضوں کو یہ طالب علمانہ شبہہ ہو سکتا ہے کہ متقی اور عادل وغیرہ ہونا اوصاف باطنی ہیں، اس کی تمیز کس چیز پر رکھی جائے؟ رہا ظاہری تقویٰ وطہارت تو اس کی بابت خود محدثین کو تلخ تجربہ ہے۔" اس کا جواب یہ ہے کہ آیاتِ بالا کے عموم سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ظاہر پر حکم نہ دینا اور باطن پر معلق رکھنا تکلیف مالایطاق ہے۔ لَا يُكَلِّفُ

اللہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ پھر کیا یہ حکم مصلحت و حکمت خداوندی کے خلاف نہیں ہے؟ خدا تو حکم دیتا ہے کہ تم میں سے دو عادل شخص اس پر حکم لگائیں۔ اب کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ عدالت کا علم نہیں ہو سکتا لہذا خدا کا یہ حکم نعوذ باللہ بے معنی اور لائق اعتماد نہیں ہے؟ کیا آیات مذکور میں محض تصرف باطنی کا حکم ہے یا محض ظاہر بینی کا؟ خوب غور کر لیا جائے تا کہ یَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ کا مفہوم واضح ہو جائے۔ بخاری میں ہے "عن عبد اللہ بن عمر عن سعد بن وقاص عن النبی صلعم انه مسح علی الخفین وان عبد اللہ بن عمر سأل عمر عن ذلك فقال نعم اذا حدثك شيئاً سعد عن النبی صلعم فلا تسأل عنه غيره۔ نیز بیہقی نے مدخل میں حضرت عبد اللہ بن عباس سے مرفوعاً اور موقوفاً روایت کیا ہے "لا تاخذ وا العلم الا ممن تقبلون شهادته" وروی ایضا من طریق الشعبی عن ابن عمر عن عمرؓ قال كان يامرنا ان لا ناخذ الا عن ثقة۔

لفظ ثقہ کوئی غیر مانوس لفظ نہیں ہے، بلکہ اس کی اصل کلام عرب میں پائی جاتی ہے۔ زہیر کہتا ہے:۔

اخی ثقة يهلك الخمر ماله ولكنه قد يهلك المال نائله

اس کی جمع ثقات وغیرہ آتی ہے یعنی قابل اعتبار، دیانت دار، اور معتبر لوگ۔ لہذا سمجھ لینا چاہیئے کہ محدثین کرام جب اس لفظ کو بولتے ہیں تو تنہا یہ لفظ قبول روایت کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اور یہ ایک ایسا وصف ہے کہ دنیا میں خبروں کے رد و قبول کے لئے ہر جگہ مسلم ہے، اسی وصف کو ہر شخص ہر خبر دینے والے میں دیکھتا ہے اور عرفاً اس کے مفہوم کو بھی جانتا ہے۔ مگر کسی قوم نے مسلمانوں سے بڑھ کر اس کا عملاً لحاظ نہیں کیا چنانچہ علامہ ابن حزم بالکل صحیح فرماتے ہیں:۔

"نقل الثقة عن الثقة حتى تبلغ به النبی صلعم مع الاتصال خص اللہ به المسلمين دون سائر الملل"[۵]

خلاصہ یہ ہے کہ محدثین جب لفظ عدالت بولتے ہیں تو اس کے متداول معنی مراد نہیں ہوتے بلکہ صرف

[۵] تدریب

عدالت فی روایت الحدیث مراد ہوتی ہے۔ اور اس عدالت کی حقیقت روایات میں اجتناب عن الکذب ہے
شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ راویوں کو سچا سمجھنا تو خود محدثین کی رائے ہے جو محض ظنی اور اجتہادی چیز ہے۔ سو اسے
معلوم ہونا چاہئے کہ شخص عادل وضابط کے بیان پر وثوق کرنا اور سچا سمجھنا تو نصی اور اتفاقی مسئلہ ہے صرف
اہل اسلام کا نہیں بلکہ تمام دنیا کا۔ گواہ عادل کی گواہی پر حکم لگانا، نصی اور اتفاقی بات ہے۔

نصوص ذیل پر ایک اجمالی نظر (۳) یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَتَبَیَّنُوْا،
(۴) مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّھَدَآءِ، (۵) لَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْہُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ
بِاَنْفُسِھِمْ خَیْرًا وَّقَالُوْا ھٰذَا اِفْکٌ مُّبِیْنٌ، (۶) وَلَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْہُ قُلْتُمْ مَّا یَکُوْنُ
لَنَا اَنْ نَّتَکَلَّمَ بِھٰذَا سُبْحٰنَکَ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ (۷) لَعْنَةُ اللّٰہِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ،
(۸) لَقَدْ کَانَ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ، (۹) وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ
عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجٰھِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا، (۱۰) کفی بالمرء کذبا
ان یحدث بکل ما سمع، (۱۱) من کذب علی متعمدا فلیتبوء مقعدہ من النار الخ
(۱۲) نضر اللہ امرءا سمع مقالتی فوعاھا واداھا، (۱۳) من رغب عن سنتی فلیس منی،
(۱۴) لیبلغ الشاھد الغائب، (۱۵) ارجعوا الی اھلیکم فعلموھم، (۱۶) صلوا کما
رأیتمونی اصلی، (۱۷) بلغوا عنی ولو اٰیة وحدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج، (۱۸)
من حدث عنی بحدیث یری انہ کذب فھو احد الکاذبین۔

ان نصوص پر غور کرنے اور ان کے صریح اور لطیف اشارات کو مدنظر رکھنے سے مندرجہ ذیل باتیں
بادنیٰ تامل سامنے آجاتی ہیں،

(۱) قرآن حکیم کے حکم وَذَکِّرْھُمْ بِاَیّٰمِ اللّٰہِ وغیرہ آیات نے مسلمانوں کو فن حدیث کی طرف متوجہ
کیا اور لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ نے آتش بر روغن کا کام دیا۔

(۲) نصوص بالاہی نے مجبور کیا کہ سنن و آثار نبوی کی تحفظ کے لئے اصول و قوانین مرتب و منظم شکل میں پیش کئے جائیں جو ذریعہ ہوں آنحضرت صلعم کے اقوال و افعال کے تحفظ کا۔

(۳) قانون تنقید کی ایجاد، احکامات اور فضائل و ہدایات جن کو آنحضرت صلعم نے وقتاً فوقتاً ارشاد فرمایا تھا اور جو درحقیقت انہیں نصوص بالا کی تفسیریں ہیں، ان کو بقا اور دوام حاصل ہونا۔

(۴) آنحضرت صلعم کے ساتھ صحابہ کی محبت، ان کا اخلاص اور جوش فدویت و شغف جس نے اصحاب رسول اللہ صلعم کو آنحضرت صلعم کی ہر ادا کا شیدا بنا دیا تھا۔ اس لئے ضرورت داعی ہوئی کہ مستقل قوانین و اصول کے ماتحت آئندہ تحریف اور تصحیف سے آپ کے ارشادات کو پاک رکھا جائے۔

(۵) محدثین نے رواۃ کی نسبت جو کچھ الفاظ جرح و تعدیل بیان فرمائے ہیں تمام کی بنا حس اور مشاہدہ ہے نہ کہ رائے و قیاس۔ بلکہ زیادہ تر تجربیات ہیں۔ قرآن نے خود تجربہ کے لئے امارات بتائے، چنانچہ آیت[9] میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز حسی اور مشاہدات سے ہے۔ غرض جو کچھ ثقاہت و عدالت کی نشانیاں قرآن میں بتائی گئی ہیں یا احادیث میں وارد ہوئیں ہیں وہ سب حسی اور مشاہدات سے ہیں۔ پس ان امارات و علامات سے ثقاہت و عدالت ثابت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ نصی امر ہے۔ ان امارات ثقاہت و عدالت کے ساتھ عدم ظہور فسق اور غیر متہم ہونا ان امارات کا موثق اور مصدق ہے۔ راوی اور مروی عنہ کی معاصرت، اُن کا آپس میں لقا، سماع، یہ سب امور مسموعات یا مشاہدات سے ہیں۔ دو شخصوں کی معاصرت یا آپس کے ملنے جلنے اور سماع کو شخص حاضر رویت و مشاہدہ سے جانتا ہے۔ غائب حاضر کی شہادت سے جان سکتا ہے۔ رواۃ کا ثقہ ہونا حاضرین کو ملاقات اور تجربہ سے معلوم ہوتا ہے اور غائبین کو اُن کی شہادت اور اُن کے درمیان شہرت سے۔ پس کسی محدث کا کسی حدیث کو صحیح یا ضعیف یا موضوع وغیرہ کہنا مسائل اجتہادیہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ فقیہ اپنی رائے و قیاس پر خود ایسا اعتماد نہیں رکھتا کہ حتمی حکم لگائے اور عمل کرنا واجب قرار دے۔ بخلاف محدثین کے کہ وہاں روایت کے صحیح ثابت ہو جانے پر عمل کرنا واجب ہو جاتا ہے "انھم اتفقوا علی وجوب

العمل بکل ما صح" یعنی تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ جو حدیث آنحضرت صلعم سے صحت کو پہنچ جائے گی اس پر عمل واجب ہوگا۔

یہ ایک اجمالی نقشہ تھا جو پیش کیا گیا۔ اصحاب رسول اللہ صلعم نے انہیں نصوص سے اصول حدیث اور قواعد روایت استنباط فرمائے۔ احادیث کی تحقیق وتنقید اور فن جرح وتعدیل کی ایجاد خود حضرت عمر فاروقؓ نے کی ہے۔

واقعاتِ ذیل پر غور کیا جائے :۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ایک مرتبہ آپ سے ملنے آئے اور تین دفعہ استیذان کے قاعدہ پر السلام علیکم فرمایا حضرت عمرؓ اس وقت کسی کام میں مصروف تھے اس لئے متوجہ نہ ہوئے۔ کام سے فارغ ہو چکنے کے بعد فرمایا کہ ابوموسیٰ کہاں ہیں؟ وہ آئے تو فرمایا کہ کیوں واپس گئے؟ ابوموسیٰؓ نے کہا میں نے رسول اللہ صلعم سے سنا ہے کہ تین مرتبہ اذن مانگو، اگر اس پر بھی اجازت نہ ملے تو واپس جاؤ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس روایت کا ثبوت دو ورنہ میں سزا دوں گا۔ ابوموسیٰ اشعریؓ گھبرائے ہوئے صحابہ کے پاس گئے اور نفس واقعہ بیان کیا۔ حضرت ابوسعید خدریؓ نے آکر تصدیق کی کہ میں نے آنحضرت صلعم سے یہ حدیث سنی ہے۔ ابی بن کعب نے فرمایا عمر تم رسول اللہ صلعم کے اصحاب کو عذاب دینا چاہتے ہو؟ فرمایا میں نے ایک روایت سنی اور اس کی تصدیق کرنی چاہی۔ چنانچہ جب سقط کا مسئلہ پیش آیا تو حضرت عمرؓ نے صحابہ سے مشورہ طلب کیا مغیرہ بن شعبہؓ نے اس کے متعلق ایک حدیث روایت کی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم سچے ہو تو اور کوئی گواہ لاؤ۔ جب محمد بن مسلمہ نے تصدیق کی تب حضرت عمرؓ نے تسلیم کیا۔ اسی طرح حضرت عباسؓ کے مقدمہ میں ایک حدیث پیش کی گئی تو حضرت عمرؓ نے تائیدی شہادت طلب کی۔ لوگوں نے شہادت دی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا مجھ کو تمہاری نسبت بدگمانی نہ تھی لیکن میں نے حدیث کے متعلق اطمینان کرنا چاہا۔ غرضیکہ حضرات خلفاء اربعہ نے اسی اصول کے ماتحت ضرورت کے وقت صحابہ سے استفسار فرما کر احادیث وفیصلۂ نبوی کی

جستجو و تحقیق فرمائی۔ یہ اور اس طرح کے کتنے واقعات ہیں جن سے روایات کے رد و قبول پر روشنی پڑتی ہے۔
لیکن افسوس ہے کہ لوگوں نے ان واقعات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مخلوق الٰہی کو سنن و آثار نبوی سے بدظن کر دینے کی کوشش کی ہے، حالانکہ انھیں اگر تحقیق مدنظر ہے تو اس کا موقع قیامت تک ہے۔ کرتے رہیں۔ لیکن تصویر کے ہر رخ پر نظر رکھتے ہوئے قدم اٹھائیں اور جس طرح اپنے مدعا کے ثبوت میں کتب طبقات و رجال وغیرہ سے دلائل پیش کرتے ہیں خدارا اسی جگہ دوسرے رخ کو بھی ملاحظہ فرمالیں۔ یہ عیب کی بات ہے کہ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ پر عمل کیا جائے اور اس کا نام تحقیق و اجتہاد رکھا جائے اس طرح کے جملہ شکوک و شبہات پر مفصل بحثیں تذکرۃ الحفاظ، فتح الباری، اور جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبدالبر، و تاویل مختلف الحدیث وغیرہ میں پوری دیانت اور ایمانداری کے ساتھ موجود ہیں جن کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ستم تو یہ ہے کہ حضرات شیخین رضؓ پر یہ اتہام لگایا جاتا ہے کہ روایت حدیث کے مخالف تھے لیکن انہیں کیا معلوم کہ خود حضرت ابوبکرؓ سے (۱۴۲) اور حضرت عمرؓ سے (۵۳۷) احادیث مروی ہیں[1] نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے تو خلیفہ اولؓ کی مرویات کو آٹھ سو بیان فرمایا ہے[2]۔

اصحاب رسول اللہ صلعم کو اپنی ذمہ داری اور رسول اللہ صلعم پر غلط گوئی سے بچنے کی اس درجہ احتیاط تھی کہ جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ صرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اس واقعہ کو سامنے رکھئے۔ عمر بن شیبانی کہتے ہیں کہ میں ابن مسعودؓ کے پاس بیٹھا کرتا تھا وہ قال رسول اللہ کبھی نہیں کہتے تھے اور جب قال رسول اللہ کہتے تھے تو مارے ڈر کے کانپنے لگتے تھے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ نے اس طرح فرمایا یا ایسا ہی فرمایا یا تقریباً ایسا ہی فرمایا، یا۔ یا۔ یا۔ اس کامل احتیاط کے باوجود آپ سے (۸۴۸) احادیث مروی ہیں[3] حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اپنے تلامذہ کو تاکید فرماتے کہ روایت حدیث میں کسی طرح بے احتیاطی نہ ہونے پائے۔ علماء نے لکھا ہے، "یشدد فی الروایۃ ویزجر تلامذتہ عن التھاون فی ضبط

[1] تلقیح فہوم الاثر [2] تقصار جیود الاحرار صفحہ ۷ [3] تلقیح فہوم الاثر۔

الالفاظ“ چنانچہ اسی احتیاط کی بنا پر ایک صحابی دوسرے صحابی کو غلط فہمی کے سوا کذب کا مصداق نہیں ٹھہراتا تھا۔ تاہم عامہ صحابہ کا خوف یکساں نہ تھا اور نہ سب کی طبیعت یکساں ہونی ممکن ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم سیرۃ رسول سے بالکل محروم رہ جاتے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کا واقعہ بخاری میں موجود ہے فرماتے ہیں، لو وضعتم الصمصامۃ علی ھذا و اشار الی قفاہ ثم ظننت انی انفذ کلمۃ سمعتھا من النبی صلعم قبل ان تجیزوا علی لانفذتھا“ یہ ہیں وہ واقعات جن کی روشنی میں اصول حدیث کی اہمیت اور ناقابل تردید جدوجہد کا سراغ ملتا ہے کہ یہ فن کس قدر اپنے اندر صحیح اور عقلی حقائق و معارف رکھتا ہے۔ (باقی)

تنزیل وتاویل

امثال القرآن

از جناب مولوی محمد ایوب صاحب جیراجپوری

[قرآنی مباحث میں امثال کی جو اہمیت ہے اس کا اندازہ قرآن کے ہر طالب علم کو ہوگا۔ یہ مثلیں اپنے اندر بے شمار اسرار اور حقائق کا خزانہ رکھتی ہیں، جن کے سمجھنے کے بعد قرآنی اعجاز بلاغت کا کمال معلوم ہوسکتا ہے۔ علامہ ابن قیمؒ کا نام قرآنی بصیرت رکھنے والوں میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ موصوف کی مجتہدانہ ژرف نگاہی اور قرآن فہمی کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اپنی تصنیف اعلام الموقعین میں انھوں نے ایک مفید بحث خاص امثال القرآن کے متعلق فرمائی ہے۔ عام استفادہ کی خاطر اس کا آزاد ترجمہ ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں (ایوب جیراجپوری)]

تمثیل کی غرض یہ ہوتی ہے کہ کسی غیر واضح اور غیر محسوس حقیقت کو مخاطب کے فہم سے قریب تر لانے کیلئے کسی ایسی چیز سے تشبیہ دی جائے جو واضح اور محسوس ہو۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھو کہ جو چیز عام نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہے تمثیل کے ذریعہ سے گویا اس کا مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں یہ طرز بیان بڑی کثرت کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے کیونکہ جن حقائق سے وہ آگاہ کرنا چاہتا ہے وہ قریب قریب سب کے سب غیر مرئی و غیر محسوس

ہیں۔ لہذا قرآن مجید کی تمثیلات کا مضمون بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس میں تدبر کرنا مطالب قرآن کو سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔

(۱) قرآن منافقین کے بارے میں کہتا ہے:۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا
فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ
وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ۝ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ
فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝ أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ
ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ
فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ
وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ۝ يَكَادُ الْبَرْقُ
يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا
فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَاءَ
اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ إِنَّ
اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (بقرہ-۲)

ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی، پھر جب اسکے آس پاس کی چیزیں چمک اٹھیں تو اللہ نے ان کا نور سلب کر لیا اور ان کو تاریکیوں میں چھوڑ دیا کہ ان کو کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ بہرے گونگے اندھے ہیں کہ وہ پھر (راہ راست پر) نہیں آسکتے یا مثلاً آسمانی بارش آئی جس میں تاریکیاں ہیں اور گرج اور بجلی کڑک کا یہ حال ہے کہ وہ جان کے خوف سے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں اور چمک کا یہ زور ہے کہ آنکھیں اندھی ہوئی جاتی ہیں۔ اور کافروں کو چاروں طرف سے اللہ نے گھیر رکھا ہے۔ جب جب انکے آگے بجلی چمکی وہ اس کی روشنی میں کچھ دور چل لیے اور جب ان پر تاریکی چھا گئی تو کھڑے (کے کھڑے) رہ گئے۔ اور اگر اللہ چاہے تو ان کی سننے اور دیکھنے کی قوتیں سلب کرلے۔ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے منافقین کے حسب حال دو مثلیں بیان کی ہیں۔ ایک ناری دوسری آبی۔ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ اس میں فلسفۂ ہدایت کی گہری حکمت پنہاں ہے۔ یہی دونوں چیزیں (آگ اور پانی) روشنی اور زندگی کا سرچشمہ ہیں۔ آگ روشنی کی اصل ہے اور پانی زندگی کی اصل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی وحی کے متعلق فرماتا ہے کہ اس کے اندر دلوں کے لئے زندگی اور نور ہے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام اس نے روح

اور نور رکھا ہے۔ اسے قبول کرنے والوں کو "احیاء" (زندہ) کہتا ہے جو روشنی میں ہیں، اور منکرین کو "اموات" (مردہ) بتاتا ہے جو تاریکی کی وادیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ یہاں منافقین کی حالت اس مناسبت سے بیان کی ہے کہ انھوں نے وحی الٰہی کو دلیل راہ بنایا لیکن اپنی ہی خریدی ہوئی بدبختیوں کی بدولت اس پر قائم نہ رہ سکے اسی لئے ان کو اس شخص کے مشابہ قرار دیا ہے جس نے آگ جلائی روشنی حاصل کرنے اور بہرہ مند ہونے کے لئے لیکن اس کی یہ کوشش نتیجہ خیز نہ ہوئی۔ منافقین کی حالت اس سے بالکل ملتی جلتی ہے بایں طور کہ انھوں نے دائرۂ اسلام میں قدم رکھا، اس کی روشنی میں چلنا چاہا، فوائد حاصل کئے، اس کے دامن میں پناہ لی اور مسلمانوں میں مل گئے لیکن چونکہ اس میل ملاپ کا محرک کوئی ایمانی جذبہ نہ تھا جس کا نور ان کے دلوں میں واقعۃً موجود ہوتا اس لئے اللہ نے اسلام کی یہ روشنی ان کے دلوں سے بجھادی اور ان پر ظلمتِ تاریکی کا پردہ ڈال دیا۔ ذرا قرآن کی اس حکمت پر بھی ایک نظر ڈالو کہ اس نے "ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ" (ان کی روشنی زائل کردی) کہا ہے "بنارھم" یعنی ان کی آگ بجھادی نہیں کہا۔ آگ کی خاصیت روشنی بخشنا اور جلانا دونوں ہے۔ سو اللہ نے روشنی تو ان سے سلب کرلی اور جلانے کی تاثیر باقی رکھی اور ان کو تاریکیوں میں بھٹکتا چھوڑ دیا۔ یہی اس شخص کی صحیح تصویر ہے جس نے بینائی سے کام لیا پھر آنکھوں پر خود ہی پٹی باندھ لی۔ معرفت و ہدایت کی سعادت حاصل کی پھر خود ہی انکار و تکذیب کی لعنت اوڑھ لی۔ حدودِ اسلام میں داخل ہوا پھر باطنی لحاظ سے آپ ہی آپ الٹے پاؤں پھر گیا اور ادھر کا رخ نہ کیا۔ اسی وجہ سے ان کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ "وہ اب لوٹنے والے نہیں"۔

اب ذرا قرآن کی آبی تمثیل کے آئینہ میں بھی منافقین کی تصویر دیکھ لو۔ قرآن کہتا ہے کہ منافقین کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جو چلتے چلتے زور شور کی بارش میں گھر گئے ہوں۔ بادلوں کی ہمہ گیر تاریکی ان پر مسلط ہے۔ ہولناک بجلیوں کی کڑک چمک ہے۔ ضعف قلب اور سراسیمگی سے ان کا برا حال ہے۔ تاریکی میں کبھی کبھی رہ رہ کر بجلی چمکتی ہے تو اس کی مدد سے دو قدم چل لیتے ہیں لیکن جب زور کی بجلی

کوکتی اور کوندتی ہے تو ڈر کے مارے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں اور آنکھیں بند کر لیتے ہیں کہ کہیں صاعقۂ آسمانی آنہ لے اور تار حیات ٹوٹ نہ جائے۔ بس اسی طرح ان منافقین کے لئے بھی رحمت الٰہی کی وہ بارش جو قرآن کی صورت میں ہوئی، ان کی اپنی کمی عقل ضعف دماغ اور قلت علم و بصیرت کی وجہ سے زحمت بن گئی۔ قرآن کے احکام امر و نہی، اس کی دعوتِ جہاد و قتال، اور نفس پرستوں پر اس کی زجر و توبیخ ان کے لئے بجلی کی کڑک اور چمک بن گئے جن کی تاب لانا ان کے بس میں نہ تھا۔ ہلکی ہلکی بے ضرر تعلیمات کی روشنی میں تو وہ کچھ چل لیتے ہیں۔ مگر جہاں آزمائش کے معاملات آجائیں، یا جہاں تاویلات کی گنجائش نہ دے کر دو ٹوک فیصلہ کر دینے والی آیت آجائے وہاں وہ سخت کشمکش اور پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ جب گمراہ اور بدعتی فرقوں کے سامنے قرآن کی کوئی صریح آیت پیش کر دی جاتی ہے تو وہ ایسے سٹ پٹاتے ہیں کہ گویا بکریوں کے سامنے شیر آگیا، حالانکہ قرآن کی آیت تو فی نفسہٖ رحمت ہے، مگر ان کے لئے سخت مصیبت بن جاتی ہے۔ اس کی چکا چوند میں وہ الٹا اور راستہ بھول جاتے ہیں اور اس کی آواز ان کے لئے بجلی کا کڑکا بن جاتی ہے جس سے جان بچانے کے لئے انہیں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لینی پڑتی ہیں۔ ان کی یہ حالت کیوں ہوتی ہے؟ صرف اس بنا پر کہ ان کی عقلوں اور دلوں پر حق سے نامانوسیت اور بیگانگت کا پردہ پڑا ہوا ہے اور ان کے کمزور دل صفاتِ الٰہی کے روحانی بار کو اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس وجہ سے وہ اعراض و نفرت پر تل جاتے ہیں۔ یہی نہیں کے مثل ان مشرکوں کا (خواہ ان کے مختلف گروہ اپنے مشرکانہ خیالات میں کتنے ہی مختلف ہوں) حال بھی ہے جن کے سامنے خالص مسئلۂ توحید مبرہن ہو کر آجاتا ہے اور قطعی دلائل و نصوص ان کے مشرکانہ اوہام کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتے ہیں تب بھی ان کے دلوں میں ایمان کی روشنی پیدا نہیں ہوتی، بلکہ ان پر قرآن کی باتیں شاق گزرتی ہے اور وہ اس سے اس قدر وحشت کھاتے ہیں کہ اگر ان کا بس چلے تو اپنے کانوں کو بند کرنے میں بھی دریغ نہ کریں۔ اسی طرح اگر تم اصحابؓ سرور کونین صلعم سے

بھی دشمنی رکھنے والوں کو دیکھوگے تو انہیں بھی اسی مرض میں گرفتار پاؤگے۔ جب خلفائے راشدین اور صحابہؓ کی حقانیت اور بزرگی ثابت کرنے والی صریح نصوص ان کے سامنے بے نقاب ہو کر آتی ہیں تو اُن سے بڑھ کر کوئی چیز ان کیلئے سوہان روح نہیں ہوتی اور نہایت بے باکی کے ساتھ وہ ان حقائق کا انکار کر دیتے ہیں۔ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ان تمام مرضائے قلوب کو منافقین کی اس معنوی حالت سے جس کی مثال اللہ نے بیان فرمائی ہے ایک خاص مناسبت ہے۔ اس لئے کہ ان کے حالات اور اعمال بالکل انھیں کے سے ہیں اور دلوں کی مشابہت ہی اعمال کی مشابہت کی باعث ہوتی ہے۔ ایک جماعت یا ایک فرد کے افعال وکردار میں اگر ہمرنگی ہے تو جان لو کہ ان کی کیفیت نفسی اور ان کی صورت روحانی میں بھی ضروری مشابہت ہے۔

(۲) سورہ رعد میں اسی فلسفۂ ہدایت کو دوسرے پہلو سے بیان کیا گیا ہے۔ وہاں مومنین کو سامنے رکھ کر ان کے بارے میں بھی یہی دونوں، ناری و مائی تمثیلیں بیان فرمائی گئی ہیں مگر دیکھو کہ دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے:-

أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ (رعد-۲)

اللہ نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر اپنی اپنی (سمائی کے) بقدر اس ندی نالے بہ نکلے۔ پھر (پانی کے) ریلے میں جھاگ بن کر ابھر آئے۔ اسی طرح زیور یا دوسرے ساز وسامان بنانے کے لئے (معدنیات کو) جب لوگ آگ میں تپاتے ہیں تو ان میں بھی اسی طرح کا جھاگ ہوتا ہے۔ یوں اللہ حق و باطل کی مثالیں بیان فرماتا ہے۔ سو جھاگ تو رائگاں جاتا ہے اور (پانی) جو لوگوں کے کام آتا ہے زمین میں ٹھیرا رہتا ہے۔ اللہ اسی طرح مثالیں بیان فرماتا ہے

یہاں اللہ تعالے نے اپنی وحی کو جسے وہ قلب انسانی کو زندہ کرنے کے لئے اتارتا ہے پانی سے تشبیہ دی ہے جو زمین کو زندہ کرنے کے لئے برسایا جاتا ہے اور دلوں کو ندی نالوں سے تشبیہ دی ہے جس طرح ندی نالے آسمان کی بارش کو اپنی اپنی وسعت کے مطابق اپنے سینوں میں بھر لیتے ہیں اسی طرح انسانی قلوب بھی دریائے معرفت

سے بقدرِ ظرف لے لیتے ہیں۔ جو قلب جتنی زیادہ وسعت رکھتا ہے وہ اسی قدر علم و بصیرت کا خزانہ وحی الٰہی کے فیضانِ عام سے حاصل کرلیتا ہے۔ پانی کے ساتھ وحی اور ندی نالوں کے ساتھ قلوب کی تشبیہ کس قدر بلیغ ہے۔ پھر دیکھو بادلوں سے جب بارش ہوتی ہے اور زمین پر پڑکر دھارے کی شکل میں بہنے لگتی ہے تو اس وقت زمین کی تمام غلاظتیں اور میل کچیل اور خس و خاشاک سب ابھر کر سطحِ آب پر آجاتے ہیں مگر چند لمحوں کے بعد کہیں ان کا نام و نشان تک نہیں رہتا، اور وہی پاک صاف پانی باقی رہ جاتا ہے جو انسان کے لئے مفید ہے۔ اسی طرح علم و بصیرت اور رشد و ہدایت کا آبِ حیوان بھی جب قلوب کی وادیوں میں اترتا ہے تو پہلے تمام دبی ہوئی کثافتوں کو ابھار دیتا ہے اور بالآخر نفسانی خواہشوں اور شکوک و اوہام کی گندگیوں کو فنا کرکے دلوں کو انوارِ الٰہی کا مہبط بنا دیتا ہے۔ اس کی مثال بعینہٖ دوا کی سی ہے جو جسم کے اندر داخل ہوکر تمام اخلاطِ جسم کو ابھار دیتی ہے اور مریض ایک طرح کی ناگواری محسوس کرتا ہے حالانکہ اخلاط کا ابھرنا دوا کے فوائد میں سے ہے کیونکہ وہ انھیں ابھارتی ہی اس لئے ہے کہ فنا کردے، جیسا کہ اس کی فطرت کا خاصہ ہے۔ ان حقائق کو سامنے رکھو اور پھر حق و باطل کی باہمی آویزش کا تصور کرو۔ حق نمودار ہوتا ہے تو دلوں میں چھپی ہوئی باطل کی تمام قوتیں سر نکال لیتی ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ حق خود ہی کرید کر ان قوتوں کو ابھارتا ہے۔ تاکہ انھیں باہر نکال پھینکے۔ کچھ مدت تک تو وہ قوتیں ایک بحرانی کیفیت میں ابھری رہتی ہیں لیکن آخر کار فنا ہوجاتی ہیں اور آئینۂ قلب بالکل صاف ہوکر چمک اٹھتا ہے۔ یہ تمثیل تو مائی تھی۔ ناری تمثیل بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے:۔

وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ

اور یہ جو لوگ، زیور یا دوسرے سازو سامان کے لئے (معدنیات کو) آگ میں تپاتے ہیں اس میں (بھی)، اسی طرح جھاگ اٹھتا ہے

معدنیات جب آگ میں پگھلائی جاتی ہیں تو ان میں سے میل کا جھاگ اٹھتا ہے۔ اصل جوہر نیچے رہ جاتا ہے جو انسانی ضروریاتِ زندگی کے لئے کارآمد ہے اور جھاگ ذرا اڑکر چھنٹ جاتا اور سوخت ہوجاتا ہے۔ ایمان و ہدایت کا معاملہ بھی ایسا ہی کچھ ہے۔ ایمان کی گرمی جب پہنچتی ہے تو مومن کے قلب کو اپنے اندر کی کثافتوں کا شدید احساس

ہوتا ہے اور وہ پریشان ہونے لگتا ہے۔ مگر یہ آگ شہوات اور شبہات کی گندگیوں کو اس طرح چھانٹ کر پھینک دیتی ہے جس طرح بھٹی کی آگ معدنیات کے میل اور زنگ کو۔ پھر جس طرح ملاوٹ نکل جانے اور سوخت ہو جانے کے بعد معدنیات کا خالص جوہر انسانوں کو فائدہ پہنچاتا ہے اسی طرح نور ایمان بھی قلب مومن میں متمکن ہو کر نہ صرف اس کو بلکہ اس کے ذریعہ سے ایک جہان کے جہان کو فائدہ پہنچاتا ہے۔

(۳) اب دنیوی زندگی اور صاحبِ دنیا کی مثال بیان کی جاتی ہے:-

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاۗءٍ	دنیوی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے مثلاً ہم نے آسمان کا پانی
اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ	برسایا اور اس سے زمین کی نباتات جس کو آدمی اور چوپائے کھاتے
الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ۭ حَتّٰٓي	ہیں سیراب ہوئی، یہاں تک کہ جب زمین نے اپنا سنگھار کر لیا
اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ	اور خوشنما ہو چکی اور اہل زمین نے سمجھ لیا کہ اب وہ ان کی ہے
اَنَّھُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىھَآ اَمْرُنَا لَيْلًا	تو (ناگاہ) ہمارا حکم اس پر رات یا دن کے وقت نازل ہو گیا
اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰھَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ	اور ہم نے اس کا ایسا ستھراؤ کیا کہ گویا کل اس کا نام و نشان
بِالْاَمْسِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ	ہی نہ تھا۔ جو لوگ سوچتے اور سمجھتے ہیں ان کے لئے ہم اپنی
يَّتَفَكَّرُوْنَ ؀ (یونس - ۳)	نشانیاں اسی طرح تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے دنیوی زندگی کی تشبیہ اس طرح دی ہے کہ دنیا جب زیب و زینت کے لباس میں بن سنور کر سامنے آتی ہے تو انسان اس پر مفتون ہو جاتا ہے اور حصول دنیا ہی اپنا مطمح نظر قرار دے لیتا ہے حتیٰ کہ فریب نفس اُسے یہاں تک پہنچا دیتا ہے کہ وہ اس زینتِ حیات کو اپنی ملک اور اپنے قبضۂ قدرت میں سمجھنے لگتا ہے۔ اس وقت یکایک کرشمۂ الٰہی نمودار ہوتا ہے اور اس کے ہاتھوں سے یہ محبوب ترین متاع چھین کر اسے خسران و ناکامی کی ناگہانی مصیبتوں اور حیرتوں میں چھوڑ جاتا ہے۔ اس کیفیت زندگی کی تشبیہ اللہ تعالیٰ نے زمین سے دی ہے جس پر بارش کی کرشمہ سازی سے نباتات کی ہری ہری چادریں بچھ جاتی ہیں اور اس باصرہ نواز منظر کو

دیکھ کر کسان بیخود و بے اختیار ہو جاتا ہے۔ اس وقت خدا اسے یاد نہیں آتا نفس کے فریب میں آکر وہ اسے اپنی تدبر کا نتیجہ اور اپنی ملک سمجھنے لگتا ہے کہ اچانک حکم الٰہی جاری ہوتا ہے اور یہ سارا سامانِ غرور آفات و حوادث کی نذر ہو کر رہ جاتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے اس کا طلسم ظن و غرور ٹوٹ جاتا ہے اور اسے دکھائی دیتا ہے کہ جس جگہ اس کے خوش آئند تخیلات کی حسین عمارت قائم تھی وہاں شکستہ کھنڈروں کے نشان بھی اب موجود نہیں ہیں۔ یہی حال دنیا کی رعنائیوں اور اس کے پر امید اور خود فریب پرستاروں کا ہے اگر غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ دنیا اور دنیا پرست کی کتنی بلیغ تشبیہ ہے۔

ضمناً ایک اور نکتہ بھی سمجھ لو۔ چونکہ دنیا آفات و حوادث کا مرکز اور اس کے بالمقابل جنت اطمینان و سکون اور عافیت و سلامتی کا گہوارہ ہے اس لئے قرآن اس تنبیہ اور تذکیر کے بعد وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ کہہ کر جنت کی زندگی کی طرف بلاتا ہے۔ جنت کو دار السلام (سکھ کا گھر) کہنے کی وجہ یہی ہے کہ یہ مقام اُن تمام آفتوں، پریشانیوں اور بے اطمینانیوں سے مامون ہے جن کی شکار دنیا بنی ہوئی ہے۔ قرآن بلا لحاظ خاص و عام سب کو اس آنند بھون کی طرف دعوت دیتا ہے کہ عدل الٰہی اسی کا مقتضی ہے، اگرچہ ہدایت و معرفت کی سعادت صرف انہیں کو حاصل ہوتی ہے جن کو پروردگار عالم اس عزت و شرف سے نوازتا ہے وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ الخ۔

(۴) قبول حق کی استعداد اور عدم استعداد کی تمثیل :-

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ	دونوں فریقوں کی مثال اندھے، بہرے اور آنکھوں والے
وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ	اور سننے والے کی سی ہے، کیا دونوں کی حالت یکساں
مَثَلًا اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝	ہو سکتی ہے، کیا تم لوگ غور نہیں کرتے؟

قرآن نے اس آیت میں کفار کا ذکر کرتے ہوئے ان کی صفت یہ بیان کی ہے کہ وہ سننے سے معذور اور بصارت سے محروم ہیں۔ اور پھر ان کے مقابل مومنین کے اوصاف مثلاً ایمان، عمل صالح، محبت الٰہی

اور انابت الی اللہ وغیرہ کو بینائی اور سماعت سے تشبیہ دی۔ پہلے گروہ کو اندھا بہرا اس لئے کہا کہ ان کی پیشانی کی آنکھیں تو دیکھتی ہیں لیکن دلوں کی آنکھیں بے نور ہیں۔ حق کا بے نقاب چہرہ دیکھنے سے قاصر ہیں۔ اسی طرح وہ اوپر کے کانوں سے تو سنتے ہیں مگر اندر کے کانوں تک آوازِ حق کا گذر نہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی تشبیہ ایسے شخص سے دی ہے جس کی دیکھنے اور سننے کی قوتیں سلب کرلی گئی ہوں کہ نہ وہ کسی چیز کو دیکھ سکتا ہے اور نہ کوئی بات سن سکتا ہے۔ دوسرا گروہ مومنین کا ہے جو بیدار مغز ہے، جس کے دل کی آنکھ بھی صحیح سلامت ہے اور کان بھی۔ اس کو ایسے شخص سے تشبیہ دی ہے جو دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والا کان رکھتا ہے۔ یہ تمثیلیں بیان کرکے اللہ تعالیٰ ان دونوں کے برابر ہونے کی خود نفی نہیں کرتا بلکہ مخاطبوں ہی کی عقل و فکر سے سوال کرتا ہے کہ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ اس استفہامِ انکاری میں جو زور ہے وہ خود انکار کرنے میں کہاں ہو سکتا ہے۔

(۵) اولیاءِ مشرکین کی بے بسی کی مثال :۔

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن
دُونِ اللّٰهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ
اتَّخَذَتْ بَيْتًا وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ
لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝

جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسروں کو اپنا کارساز بنا رکھا ہے ان کی مثال مکڑی کی سی ہے کہ اس نے ایک گھر بنایا اور کچھ شک نہیں کہ سب گھروں میں کمزور گھر مکڑی کا گھر ہے۔ کاش یہ لوگ جانتے۔

(عنکبوت۔ ۴)

یہاں اس حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ مشرکین تو مکڑی کی طرح کمزور و ناتواں ہیں ہی لیکن ان کے اولیاء و شرکاء ان سے بھی زیادہ بے بس اور مجبور محض ہیں۔ سو ان مشرکین کی ذاتی کمزوری و بے چارگی اور پھر اپنے سے بھی بے بس تر اولیاء سے مدد و قوت حاصل کرنے کی مثال مکڑی اور اس کے گھر کی سی ہے۔ اس مثل کے تحت مشرکین کے انتہائی خسران کا ذکر ہے کہ اگرچہ وہ بے یار و مددگار ہیں لیکن وہ اپنی محرومی و

کمزوری کے نقطۂ کمال پر اس وقت پہنچے جب کہ انھوں نے اپنے سے بھی زیادہ مجبور مخلوق کو اپنا ولی و مددگار بنایا جن سے وہ سوائے ضعف و خسران کے کچھ نہیں پا سکتے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ مشرکین و کفار سبھی جانتے ہیں کہ تارِ عنکبوت کمزور ترین شے ہے پھر اس سے "لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ" کے ذریعہ ان کی واقفیت و علم کی نفی کیوں کی گئی ہے؟ اس کا جواب بالکل واضح ہے۔ آیت کا مقصد ان کے اس علم کی نفی کرنا نہیں ہے کہ مکڑی کا گھر سب سے زیادہ کمزور ہے بلکہ اس علم کی نفی کرنا ہے کہ خدائے واحد کے سوا جو معبود اور اولیا ٹھیرائے جاتے ہیں ان کی قوت اور قدرت تارِ عنکبوت سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر وہ اس حقیقت کو جانتے ہوتے تو ایسا ہرگز نہ کرتے۔ وہ تو یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ یہی اولیاء ان کو قوت و جبروت بخشیں گے لیکن اس کی حقیقت خواب سے زیادہ نہیں ہے اور نہ کبھی ثابت ہوئی۔ اس مضمون کی بکثرت آیتیں ملتی ہیں جن میں یہی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ مثلاً ایک جگہ قرآن کہتا ہے:-

وَاتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ آلِهَةً	انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر بہت سے خدا بنا رکھے ہیں کہ وہ ان کے مددگار
لِّيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا ۝ كَلَّا ۚ سَيَكْفُرُونَ بِعِبَادَتِهِمْ	ہوں گے۔ مگر وہ ہرگز مددگار نہ ہوں گے۔ قریب ہے کہ وہ خود ان کی
وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا (مریم - ۵)	بندگی کا انکار کریں گے اور الٹے ان کے دشمن ہو جائیں گے۔

دوسری جگہ ہے:-

وَاتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ آلِهَةً	ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر بہت سے خدا بنا لیے یہ سمجھ کر کہ وہ ان کی
لَّعَلَّهُمْ يُنصَرُونَ ۝ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَهُمْ	مدد کریں گے۔ مگر وہ ان کی مدد نہیں کر سکتے۔ بلکہ یہ بت پرستوں کے
وَهُمْ لَهُمْ جُندٌ مُّحْضَرُونَ (یٰسین - ۵)	لشکری بنے ہوئے قیامت میں خود جوابدہی کیلئے حاضر ہوں گے۔

ایک مقام پر مشرکین کی ہلاکت و تباہی بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:-

وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَٰكِن ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ	اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انھوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا۔ اور جب
فَمَا أَغْنَتْ عَنْهُمْ آلِهَتُهُمُ الَّتِي يَدْعُونَ مِن	تیرے پروردگار کا حکم (عذاب) آیا تو خدا کے سوا وہ جن معبودوں

دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ شَیۡءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمۡرُ رَبِّکَ ؕ وَمَا زَادُوۡہُمۡ غَیۡرَ تَتۡبِیۡبٍ (ہود - ۹)

کو پکارا کرتے تھے وہ ان کے کچھ بھی کام نہ آئے (بلکہ) انہوں نے ان کی تباہی کچھ اور بڑھادی۔

ان چاروں مقامات پر یہ حقیقت آشکارا کی گئی ہے کہ جس نے خدا کو چھوڑ کر شرکا اور اولیا کا دامن سربلندی وسرفرازی اور نصرت وامداد حاصل کرنے کے لئے پکڑا وہ ناکام رہا اور اس کی یہ عبادت مفید ومنفعت بخش ہونے کے بجائے الٹی وبال جان بن گئی۔ یہ مثل جو اوپر بیان ہوئی شرک کے ابطال، مشرکین کے خسران اور ان کے انجام کی ہولناکی اور تباہ کاری کی سب سے زیادہ روشن اور بلیغ تمثیل ہے۔ (باقی)

ترجمان القرآن کے سابق پرچے

ترجمان القرآن کے مندرجۂ ذیل سابق پرچوں کی دفتر ہذا کو ضرورت ہے۔ جو حضرات ان پرچوں کو قیمتاً فروخت کرنا چاہتے ہوں۔ یا جنکے پاس یہ پرچے فالتو موجود ہوں۔ وہ براہ کرم ان پرچوں کو بذریعہ ڈاک ہمارے پاس روانہ کردیں اور "لفافہ" پر اپنا مکمل پتہ تحریر فرمادیں تاکہ ۸؍ فی پرچہ کے حساب سے اُن کو قیمت روانہ کی جاسکے

رسائل و اخبارات کے ایڈیٹر صاحبان سے بھی گزارش ہے کہ اگر وہ مکمل فائل نہ رکھنا چاہتے ہوں۔ اور ان کے پاس یہ پرچے ہوں تو وہ بھی ان پرچوں کو بھجوا کر قیمت وصول کریں۔

سال ۵۲ھ	جلد۲	عدد۱	ماہ محرم
؍	جلد۳	عدد۲	ماہ شعبان
؍	جلد۳	عدد۳	ماہ رمضان
سال ۵۴ھ	جلد۶	عدد۱	ماہ محرم
؍	؍	؍ ۲	ماہ صفر
؍	؍	؍ ۳	ماہ ربیع الاول
؍	؍	؍ ۴	ماہ ربیع الثانی

سال ۵۶ھ	جلد۱۰	عدد۲	ماہ صفر
؍	؍	؍ ۳	ماہ ربیع الاول
؍	؍	؍ ۴	ماہ ربیع الثانی
؍	جلد۱۱	؍ ۲	ماہ شعبان
؍	؍	؍ ۳	ماہ رمضان
سال ۵۸ھ	جلد۱۲	عدد۵	ماہ جمادی الاولیٰ
؍	؍	؍ ۶	ماہ جمادی الاخریٰ
؍	جلد۱۳	؍ ۱	ماہ رجب

منیجر

سورۂ صافات کی قسمیں

از جناب مولوی داؤد اکبر صاحب

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۙ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۙ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۭ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ۭ

قرآن مجید کے ایک طالب علم نے سورۂ صافات کی قسموں کی غرض اور مقسم بہ اور مقسم علیہ میں ربط دریافت کیا ہے۔ اس باب میں قبل اس کے کہ ہم اپنی کوئی تحقیق پیش کریں مناسب ہوگا کہ مفسرین کرام کی نگاہ کشف و تحقیق نے ہماری رہنمائی کے لئے جو نقوش چھوڑے ہیں ان کی طرف مراجعت کر لی جائے تاکہ اصل مقصود تک پہنچنے میں آسانی ہو۔

پیش نظر سورہ کی قسموں کی بابت یوں تو تمام مفسرین نے کچھ نہ کچھ بحث کی ہے مگر اس بارے میں حضرت امام رازی علیہ الرحمۃ نے جس تمام و کمال سے تحقیق و تدقیق کی ہے یہ کچھ انہیں کا حق ہے۔ فرماتے ہیں اس میں دو احتمال ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ان صفات کا موصوف ایک ہی ہو۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ ان صفات کا موصوف مختلف ہو۔ پہلی صورت لینے میں اس کی مختلف توجیہیں ہوں گی :۔

ا۔ ان صفات کے موصوف ملائکہ قرار دیے جائیں۔ اس لحاظ سے تاویل یوں ہوگی۔

الف۔ وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا یعنی قسم ہے ان ملائکہ کی جو صف بستہ ہیں۔ ملائکہ یا تو عبادتِ الٰہی کے لئے صف بصف آسمانوں میں مستعد رہتے ہیں جیسا کہ انہیں کی زبانی ارشاد ہے "وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ"۔ یا اس سے یہ مقصود ہے کہ وہ اپنے روحانی بازوؤں کو فضا میں پھیلائے ہوئے امر خداوندی کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اور اس کا بھی احتمال ہے کہ فرشتوں کے صف بصف ہونے کا یہ مفہوم ہو کہ ملائکہ میں سے ہر ایک کے لئے الگ الگ درجہ معین ہے۔

ب۔ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا۔ اس کی بھی مختلف توجیہیں ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے وہ ملائکہ مراد ہیں جو بادلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیے پھرتے ہیں۔ اس کا بھی احتمال ہے کہ اس سے وہ ملائکہ مراد ہوں جو الہام کی صورت سے قلوب انسانی میں تاثیر پیدا کرتے ہیں۔ یا یہ کہ اس سے وہ ملائکہ مراد ہوں جو انسانوں سے ارواح خبیثہ کو دور کیا کرتے ہیں۔ ان اقوال کو بیان کرنے کے بعد حضرت امام رازی علیہ الرحمۃ اس دوسری صفت کے متعلق اپنے مخصوص انداز میں فرماتے ہیں :۔

"فلاسفہ کے نزدیک طے شدہ ہے کہ موجودات کی تین قسمیں ہیں ایک سراپا تاثیر ہے اور وہ خداوند تعالیٰ کی ذات بابرکت ہے۔ دوسرا عالم اجسام ہے اور یہ سراپا تاثر وانفعال ہے۔ تیسرا عالم ارواح (ملائکہ) ہے اور یہ وہ جماعتِ قدسی ہے جس میں کارساز فطرت کی طرف سے تاثر و تاثیر دونوں طرح کی قوتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ یہ ایک طرف تو انوار الٰہی سے فیضیاب ہوتی ہے اور دوسری طرف قلوب انسانی پر بھی اثر ڈالتی ہے"۔

ج۔ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا۔ اس میں اشارہ ہے کہ یہی وہ صفت ہے جس سے ملائکہ اپنی روحانیت میں ترقی دیکر عالم اجسام پر اثر ڈالتے ہیں۔

اس کے بعد امام صاحب فرماتے ہیں :۔

مقدمہ بالا کی روشنی میں غور کرو تو تم پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ پہلی صفت (وَالصّٰٓفّٰتِ) میں اشارہ ہے کہ ملائکہ صف بصف خداوند تعالیٰ کی بارگاہِ عالی میں سر نیاز خم کئے رہتے ہیں۔ اور یہی وہ طریقہ ہے جس سے ملائکہ انوار الٰہی اور تجلیات ربانی کے مہبط ہوتے ہیں۔ دوسری صفت (فَالزّٰجِرٰتِ) میں اشارہ ہے کہ جواہر ملکیہ (ملائکہ) قلوب انسانی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور انسانی قویٰ ادراکیہ کے حرکت میں لانے کے ایسے اسباب فراہم کرتے ہیں جو ان کی روحانی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ یہ نظام قدرت کی جانب سے اس لئے ہے کہ ارواح بشری اپنی تکمیل میں ارواح ملکیہ کی محتاج ہے اور یہ تو مسلمات میں سے ہے کہ ارواح بشری کی باتقویٰ

طاقتوں کے بالفعل ہونے میں ملائکہ کا بہت زبردست ہاتھ ہے۔ یہ محض دعویٰ ہی نہیں بلکہ اس کی سند میں بے شمار دلیلیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں چند ملاحظہ ہوں۔

(۱) يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ.... — وہ نازل فرماتا ہے ملائکہ کو روح کے ساتھ اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر بھی وہ مناسب سمجھتا ہے۔

ایک دوسری جگہ ہے:۔

(۲) نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ — روح امین (جبرئیل) نے تمہارے دل پر اسے نازل کیا ہے۔

اس کے بعد امام صاحبؒ نے اس آیت سے متعلق ایک اور نہایت لطیف نکتہ بیان فرمایا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:۔ حقیقی کمال کسی چیز کو اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب وہ چیز خود مکمل و اکمل ہو۔ مکمل ہونے کا یہ منشا ہے کہ وہ ان تمام خوبیوں سے آراستہ ہو جو اس کے شایان شان ہوں۔ اور اکمل ہونے کا یہ منشا ہے کہ اس کا فیض دوسروں تک پہنچے۔ اور یہ مسلم ہے کہ دوسرے کی تکمیل سے مقدم خود باکمال ہونا ہے۔ اس کے بغیر اصلاح و ارشاد بے معنی ہے۔ لہٰذا پہلی صفت میں اشارہ ہے کہ ملائکہ اپنی تکمیل کے لئے ہمہ آن طاعتِ الٰہی میں چست رہتے ہیں اور دوسری صفت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ انسانی قلوب سے وہ تمام کی تمام خرابیاں دور کرنے میں کوشاں رہتے ہیں جو فطرت انسانی کے سراسر منافی ہیں اور تیسری صفت میں اشارہ ہے کہ وہ ارواح بشری کے انوار الٰہی سے مستنیر ہونے میں شریک ہیں۔

۲۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ یہ اوصاف گروہِ انسانی پر محمول کی جائیں اور اس کی دو شکلیں ہیں:۔

(۱) وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا سے انسانوں کی وہ صفیں مراد لی جائیں جو نماز کی ادائیگی کے وقت صف بصف قائم کی جاتی ہیں، اور فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا سے نمازیوں کا اعوذ باللہ پڑھنا مراد لیا جائے گویا اس کلمہ سے نمازی اپنے پاس سے شیاطین کو دور بھگاتے ہیں۔ اور فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا سے ان کا نماز میں قرآن پڑھنا مراد لیا جائے۔ دوسری صفت کی ایک اور توجیہ بھی بہت مشہور ہے وہ یہ کہ اس کا مقصود یہ ہے کہ نمازی نہایت بلند آہنگی کے ساتھ قرآن پڑھتے ہیں جس کی مصلحت شیاطین کو بھگانا ہے چنانچہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی قرأت والی روایت

میں یہی مصلحت مذکور ہے۔

(۲) دوسری شکل یہ ہے کہ اس سے علمائے محققین کی وہ صف بصف جماعت مراد لی جائے جو دین الٰہی کی تبلیغ میں منہمک رہتی ہے اور دوسری صفت سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اوامر و نواہی میں غایت درجہ دلچسپی رکھتے ہیں اور تیسری صفت میں اشارہ ہے کہ وہ دین الٰہی کی تبلیغ بھی کرتے ہیں اور اتباع شرائع پر بھی لوگوں کو ابھارتے ہیں۔

۳۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ ان صفات کو مجاہدین (فی سبیل اللہ) پر منطبق کیا جائے یعنی پہلی صفت سے جنگ کی صفیں مراد لی جائیں اور قرآن پاک میں مذکور بھی ہے کہ "اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا"۔ دوسری صفت سے یہ مقصود ہے کہ وہ اثنائے جنگ میں گھوڑوں کو ڈانٹ بتاتی ہیں۔ اور تیسری صفت سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ میدانِ جنگ کی گرما گرمی کے وقت بھی انکی زبانیں یادِ الٰہی سے غافل نہیں ہوتیں۔

۴۔ چوتھی توجیہ یہ ہے کہ یہ صفات آیاتِ قرآنی کی ہیں اور اس کی توجیہ یوں ہوگی کہ قرآن پاک کی آیات متعدد مباحث سے متعلق ہیں۔ کچھ تو وحدانیت اور علم الٰہی پر مشتمل ہیں اور کچھ قدرت خداوندی اور حکمت ربانی کے بارے میں واقع ہیں اور کچھ اخلاقیات و شرائع سے متعلق ہیں۔ خلاصہ یہ کہ پہلی صفت میں آیاتِ قرآنی کو صف بصف اشخاص کے مشابہ قرار دیا گیا ہے اور دوسری صفت سے ان آیات کی جانب اشارہ ہے جو نواہی پر مشتمل ہیں اور تیسری صفت ان آیات سے متعلق ہے جو اعمال خیر کے وجوب پر محرک ہیں۔

اب دوسری صورت لو یعنی یہ کہ ان صفات کا موصوف ایک نہیں بلکہ الگ الگ قرار دیا جائے۔ مثلاً پہلی صفت کے موصوف پرندے ہوں جیسا کہ قرآن پاک میں بھی ہے "وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ"۔ اور دوسری صفت سے وہ تمام کی تمام چیزیں مراد لی جائیں جو معاصی سے روکنے کا ذریعہ ہوں۔ اور تیسری صفت سے (بلا تخصیص) وہ تمام کی تمام باتیں مراد لی جائیں جو کلام الٰہی میں سے پڑھی جاتی ہیں۔

اس دوسری صورت کے متعلق امام صاحب فرماتے ہیں :-

"خداوند تعالیٰ کی مخلوقات یا تو جسمانی ہیں۔ یا روحانی۔ مخلوقات جسمانیہ کے مختلف مدارج و طبقات ہیں جن میں سر مو تغیر نہیں ہوتا مثلاً زمین وسط عالم ہے اور کرہ مائی سے محیط ہے۔ پانی ہوا سے محیط ہے اور ہوا آگ سے محیط ہے۔ مزید براں یہ کہ عناصر اربعہ طبقات فلکی سے عالم اجسام کے آخری حصہ تک محیط ہیں۔ پس عالم اجسام گویا جلال الٰہی کے سامنے صف بصف کھڑا ہے۔ رہے جواہر روحانیہ ملکیہ (ملائکہ) تو وہ باوجود اختلاف مدارج و صفات دو صفتوں میں مشترک ہیں۔ ایک تو عالم اجسام میں تاثیر و تصریف ہے، جس پر یہ آیت (فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا) صریحاً دلالت کر رہی ہے۔ اور دوسری صفت خداوند تعالیٰ کی معرفت میں استغراق ہے، چنانچہ فَالتّٰلِیٰتِ ذِکْرًا میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ عالم اجسام درجہ میں عالم ارواح سے ادنیٰ ہے اور جسمانیات میں تصرف بمقابلہ عالم ارواح کے آسان ہے اس لئے پہلے درجہ میں عالم اجسام کو رکھا گیا اور دوسرے درجہ میں ان ارواح طیبہ کو رکھا جو عالم اجسام پر تصرف کرتے ہیں اور تیسرے درجہ میں ان ارواح مقدسہ کو رکھا ہے جو ہمہ تن خدا کی تسبیح و تہلیل میں لگی رہتی ہیں۔"

اس کے بعد امام موصوف نے دو ایسے گروہوں کے اقوال نقل کیے ہیں جن میں سے ایک کا خیال ہے کہ نفس اشیاء مذکورہ مقسم بہ نہیں ہیں بلکہ ان اشیاء کا خالق مقسم بہ ہے۔ اور دوسرے فریق کے نزدیک نفس اشیاء مذکورہ ہی مقسم بہ ہیں۔ چونکہ امام موصوف نے ہر دو فریق کے اقوال کے نقل کر دینے ہی پر اکتفا کیا ہے اور اپنی کوئی رائے نہیں لکھی ہے اس لئے ہم اس بحث کی تفصیل پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتے۔

حضرت امام رازیؒ نے اس سلسلہ میں ایک اور نہایت اہم بحث کی ہے جس کا ایک طالب قرآن کے سامنے ہونا نہایت ضروری ہے اور وہ اس موقع پر قسم کھانے کی ضرورت یا عدم ضرورت کا مسئلہ ہے۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں دو طرح کے شبہات پیدا ہوتے ہیں :-

(۱) ایک یہ کہ قسم کا مقصود یا تو مومن سے کوئی بات منوانا ہو سکتا ہے یا کافر سے۔ پہلی صورت تو باطل ہے اس لئے کہ مومن تو بغیر قسم ہی کے تسلیم کئے ہوئے ہے۔ اور دوسری صورت بھی باطل ہے اس لئے کہ منکر آپ کی بات قسم کھانے سے نہ تسلیم کرے گا بلکہ اسے دلیل ہی سے قائل کیا جا سکتا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ خداوند تعالیٰ نے اس سورہ کے شروع میں وحدانیت پر قسم کھائی ہے اور سورۂ ذاریات کے اوائل میں وقوع قیامت کے ثبوت میں قسم کھائی ہے۔ ان مطالب عالیہ کو (ملاحدہ و دہریہ کے اوہام باطلہ کی تردید کے ساتھ) قسم کے ذریعہ سے ثابت کرنا عقلاء کے طریقہ کے منافی ہے۔

ان شبہات کے تین جواب ہو سکتے ہیں:۔

(۱) خداوند تعالیٰ نے وحدانیت اور بعث و قیامت کو زیادہ تر ابتدائی سورتوں میں یقینی دلائل کے ساتھ ثابت کر دیا ہے۔ پھر جب دلائل قطعیہ پوری طرح بیان کر دئے گئے تو دلائل ماسبق کی تاکید کیلئے قسم کھائی گئی خصوصاً قرآن تو عربوں کی زبان میں نازل ہوا ہے اور قسم کے ذریعہ سے کلام میں زور پیدا کرنا ان کے ہاں کا عام طریقہ تھا۔

(۲) دوسرے یہ کہ جب خداوند تعالیٰ نے ان چیزوں سے وحدانیت کے ثبوت پر قسم کھائی تو اس سے متصل ہی ان براہین قاطعہ کا بھی ذکر کیا جو وحدانیت کے باب میں نہایت روشن دلائل ہیں۔ یعنی فرمایا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ۔ یہ قول اس بنا پر دلیل ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اپنے اس قول میں (لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا) بیان فرمایا ہے کہ آسمان و زمین کا نظام وحدانیت پر شاہد ہے۔ بعینہ یہاں بھی جب یہ کہا گیا کہ (اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ) تو اس کے متصل ہی بطور دلیل کے یہ بیان کیا گیا (رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ) گویا یوں کہا گیا کہ آسمان و زمین کے نظام میں تفکر توحید باری پر شاہد ہے۔ پس اے لوگو! اس دلیل میں غور کرو تا کہ تمھیں توحید کا اذعان حاصل ہو۔

(۳) یہ کلام بت پرستوں کے اعتقاد کثرت آلہہ کے ابطال میں واقع ہے۔ گویا یوں کہا گیا کہ بت پرستوں کا مسلک اتنا بودا ہے کہ اس کے ابطال کے لئے تاکید کے ساتھ بس اتنا ہی کہدینا کافی ہے کہ تمہارا خدا ایک ہے۔

حضرت امام رازی علیہ الرحمۃ نے ان آیات سے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اسے اجمالاً تین سرخیوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) مقسم بہ کی تعیین

(۲) مقسم بہ اشیاء مذکورہ ہی ہیں یا اس کے علاوہ کوئی دیگر شے ہے؟

(۳) مقسم بہ کا مقصود اس موقع پر کیا ہے؟

امام موصوف نے مقسم بہ کے بارے میں بہت سی صورتیں بیان فرما دی ہیں، مگر مقسم بہ اور مقسم علیہ میں مناسبت ڈھونڈھنے کی کوشش نہیں فرمائی، اس لیے بجز احتمالات کے نقل کرنے کے کوئی قطعی اور محکم رائے بھی ظاہر نہ کی۔ ممکن ہے ایسا اس لئے کیا ہو کہ اس سے طلبہ قرآن میں محنت و جانفشانی سے صحیح راہ تلاش کرنے کی قوت پیدا ہو۔ رہی یہ بحث کہ مقسم بہ نفس اشیاء مذکورہ ہیں یا ان کے علاوہ کوئی دیگر چیز ہے تو ہم نے جہاں تک غور کیا ہے اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ قرآن مجید میں قسم کھانے کی غایت و غرض پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ بحث پیدا ہو گئی ورنہ یہ منصۂ شہود پر نہ آتی۔ اسی وجہ سے یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ اس موقع پر قسم کھانا مناسب تھا یا نہیں یا یہ کہ یہاں پر قسم کھانے میں کیا مصالح ہیں؟ امام موصوف نے پہلے تو اس موقع پر قسم کھانے میں چند در چند زحمتیں بیان فرمائی ہیں۔ اس کے بعد ان زحمتوں کے مختلف حل بتائے ہیں لیکن ایک صاحب بصیرت سے پوشیدہ نہیں کہ امام موصوف کے ان جوابات میں بہت ہی تضاد ہے۔ مثلاً پہلے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ قسم دلائل سے مسبوق ہوا کرتی ہے، اور اصل اعتبار دلائل کا ہے، اور قسم تو محض عربوں کے عام طریقہ کے مطابق محض تاکید کے لئے لائی جاتی ہے۔ غور کیجئے ترتیب قرآن سے یہ جواب کتنا البعد ہے اس لئے کہ قسمیں تو زیادہ تر ان سورتوں میں آئی ہیں جو پہلے نازل ہوئیں۔ اور دلائل بعد کی سورتوں

میں بیان ہوئے ہیں۔ امام موصوف کے دوسرے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ قسم کے بعد اس موقع پر ایک ایسا قول مذکور ہے جس میں حجت و برہان کا بہت ہی زبردست پہلو ہے، اور قسم محض تنبیہ کے لئے ہے۔ دیکھیئے! اس جواب میں اور ماقبل والے میں کیا سرمو بھی فرق ہے؟ اور دونوں میں سے کیا ایک میں بھی اصل مسئلہ سے متعلق کچھ کہا گیا ہے؟ تیسرا جواب تو بہت ہی گرا ہوا ہے وہ اس لئے کہ پہلے دونوں جوابوں میں تو امام موصوف نے یہ دعویٰ کیا کہ قسم میں شہادت کا کوئی پہلو نہیں اور تیسرے جواب میں اس کا حجت ہونا خود ہی تسلیم کر لیا ہے گو کہ ہلکے درجہ کی حجت[1] و دلیل۔

ذیل کی سطروں میں اب ہم مقسم بہ کی تعیین قسم کی اس موقع پر ضرورت، اور مقسم بہ اور مقسم علیہ میں مناسبت کی بابت اپنی رائے پیش کریں گے لیکن مناسب ہوگا کہ قبل اس کے کہ ان مباحث کی تحقیق میں پڑیں ایک نہایت ضروری مرحلہ سے گذر لیا جائے اور وہ پیش نظر سورہ کی قسموں کے عمود کی تعیین ہے۔

سورہ کا مرکز پیش نظر سورہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ توحید اور قیامت کے ثبوت میں وارد ہوئی ہے یعنی ایک طرف تو اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں جتنی بھی مخلوقات ہیں ان میں سے ہر ایک خدا کی بے پایاں قدرت کا مظہر ہے۔ کوئی چیز اس سے بے نیاز ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہر ایک کی ضروریات کا مرکز وہی ہے۔ اس کے علاوہ تمام کے تمام رشتے بے معنی ہیں۔ مخلوقات کی احتیاج بالخصوص حضرت انسان کی ضروریات یہیں پر ختم نہیں ہو تیں بلکہ کل کی زندگی میں جب خدا کی عدالت عالیہ قائم ہوگی تو وہ رحمت خداوندی کا اور زیادہ محتاج ہوگا۔ الغرض اگر یہ سورہ غور سے پڑھی جائے تو ہر شخص کو بادنی تامل نظر آ سکتا ہے کہ پوری سورہ میں یہی دونوں حقیقتیں پھیلی ہوئی ہیں۔

مقسم علیہ کی تعیین کے بعد اب ہم مقسم بہ کی شرح و تعیین کریں گے۔

مقسم بہ کی شرح و تعیین	وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا

[1] ماخوذ از امعان فی اقسام القرآن مصنفہ صاحب نظام القرآن صفحہ ۵-۶

فَالتّٰلِیٰتِ ذِکۡرًا۔ تفسیروں کے استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ مفسرین میں سے بیشتر لوگوں کا ان اوصاف کے بارے میں یہی خیال ہے کہ ان کا موصوف گروہ ملائکہ ہے۔ ہمارے نزدیک بھی یہی صورت انسب ہے اس کے علاوہ جتنی صورتیں مذکور ہیں ان میں سے کوئی بھی چسپاں نہیں ہوتی۔ وجوہ ترجیح مناسبت کی بحث سے سمجھ میں آجائیں گے۔

قسم کی غرض اوپر کی سطروں سے مقسم بہ کی تعیین ہوگئی۔ یہ بات کہ اس موقع پر قسم کیوں لائی گئی؟ اس کا وہ جواب انسب نہیں جو حضرت امام رازی علیہ الرحمۃ نے اختیار کیا ہے بلکہ اس باب میں صاحب نظام القرآن نے قسم کا جو مفہوم بیان کیا ہے اگر اسے سامنے رکھا جائے تو وہ تمام کی تمام دقتیں جو امام موصوف کے جواب سے پیدا ہوجاتی ہیں بکلم دور ہوجائیں گی یعنی یہ کہ قسم کا اصل مقصود استشہاد ہے۔ تعظیم و احترام کا پہلو نہیں مواقع پر ہوگا جہاں خداوند تعالےٰ کی ذات بابرکت یا اس کے شعائر کی قسم کھائی گئی ہو۔ اور اس صورت میں بھی تعظیمی پہلو ضمنی ہوگا۔ اصل مقصد استشہاد و استدلال ہی ہوگا۔ کلام عرب سے بھی اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ تفصیل کے لئے امعان فی اقسام القرآن کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

سطور بالا سے مقسم بہ کی تعیین اور قسم کی حقیقت اجمالاً سمجھ میں آگئی ہوگی۔ اب ہم مقسم بہ اور مقسم علیہ میں مناسبت دریافت کریں گے۔

مقسم بہ اور مقسم علیہ میں مناسبت یہ بیان ہوچکا ہے کہ پیش نظر سورہ توحید و قیامت کے ثبوت میں وارد ہے یعنی یہ کہ اس عالم میں جتنے بھی انقلابات و تغیرات ہوتے ہیں سب کا مرکز محض ایک ذات ہے۔ وہی سب کچھ کرتی ہے۔ اس کے ایما کے بغیر کوئی تبدیلی بھی ظہور میں نہیں آسکتی۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکت ہے۔ ایسی ذات جس کی قدرت و تصرف کے بے شمار مظاہر ہیں، ضرور بالضرور اس نے اس عالم کی پیدائش کی کوئی اہم غایت رکھی ہوگی۔ اسی کو قرآن قیامت سے تعبیر کرتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پیش نظر سورہ کے دعویٰ اور دلیل میں کوئی مناسبت ہے یا نہیں؟۔

قرآن مجید کے طالب علم سے یہ مخفی نہیں کہ قرآن پاک میں بے شمار ایسی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ منجملہ جنود الٰہی ہیں۔ ذیل کی آیتوں پر غور کیجئے:۔

سورۂ انفال میں ہے:۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ
أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ
وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِ
قُلُوبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ ۚ
إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ
أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً
لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ
الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ
بِهِ الْأَقْدَامَ ۝ إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ
أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ سَأُلْقِي
فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ
فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا
مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝ (رکوع اول)

یاد کرو اس وقت کو جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کرتے تھے پس اس نے تمہاری فریاد سن لی کہ میں لگاتار ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا اور خدا نے فرشتوں کی مدد تمہیں خوش کرنے کیلئے کی ورنہ فتح تو خدا ہی کے ہاتھ میں ہے بیشک خدا غالب اور حکمت والا ہے یاد کرو اس وقت کو جب کہ خدا تمہاری تسکین کیلئے نیند تم پر طاری کرتا تھا اور آسمان سے تم پر پانی برسا رہا تھا کہ اس سے تم کو پاک کرے اور شیطانی گندگی تم سے دور کردے اور تاکہ تمہارے دلوں کی ڈھارس بندھائے اور اس کے ذریعہ سے تمہارے قدم جمائے رکھے، یاد کرو اس وقت کو جب کہ تمہارا پروردگار فرشتوں کو حکم دے رہا تھا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں پس تم مسلمانوں کے قدم جمائے رکھو عنقریب کافروں کے دل میں رعب ڈالیں گے پس مارو گردنوں پر اور مارو ان کے پور پور پر۔

ایک دوسری جگہ ہے:۔

ثُمَّ أَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ
رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ

پھر خدا نے اپنے رسول پر اور مسلمانوں پر تسلی نازل فرمائی اور غیر مرئی فوجیں بھیجیں اور کافروں کو سخت مار ماری

تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۝ (توبہ-۴)

اورکافروں کی یہی جزا ہے۔

ایک دوسرے موقع پر ہے:-

إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ (توبہ-۶)

اگر تم اس کی مدد نہ کرو (تو کچھ پروا نہیں)، اس لئے کہ اس وقت اپنے رسول کی مدد کی تھی جب کافروں نے گھر سے باہر نکال دیا دو میں دوسرے اس وقت یہ دونوں، غار میں تھے، یاد کرو اس وقت کو جبکہ وہ اپنے رفیق سے کہہ رہا تھا غم نہ کرو بیشک خدا ہمارے ساتھ ہے پس خدا نے اپنی تسلی اس پر نازل فرمائی اور غیر مرئی افواج سے اس کی مدد کی اور کافروں کی بات کو نیچی کر دیا اور خدا ہی کا بول بالا ہے اور خدا غالب حکمت والا ہے۔

ایک اور مقام پر ہے:-

إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَن يَكْفِيَكُمْ أَن يُمِدَّكُمْ رَبُّكُم بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُنزَلِينَ ۝ بَلَىٰ إِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُم مِّن فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ۝

(آل عمران-۱۳)

یاد کرو جبکہ تم مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمہارے لئے یہ بس نہیں ہے کہ تمہارا پروردگار تین ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے ضرور، بلکہ اگر تم ثابت قدم رہو اور تقویٰ اختیار کرو اور دشمن اسی دم تم پر چڑھ دوڑیں تو تمہارا پروردگار پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔

سورۂ ذاریات میں ہے:-

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ۝ کہا تمھاری کیا مہم ہے اے فرستادگان .. وہ بولے ہم ایک

قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ مُجْرِمِينَ ۝ لِنُرْسِلَ گنہگار قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ ان پر پتھراؤ کریں جو

عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِنْ طِينٍ ۝ مُسَوَّمَةً عِنْدَ مسرفین کے لئے خدا کے یہاں نامزد ہے . . . .

رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِينَ ۝ (رکوع ۲)

مذکورہ بالا آیات میں تصریح ہے کہ خدا کی غیر مرئی فوجوں میں سے ملائکہ بھی ہیں اور اس غیر مرئی فوج سے بارہا اس نے حق پرستوں کی تائید کی ہے، اور پرستاران باطل کو پسپا کیا ہے۔ ایسا تقریباً ہر پیغمبر کے عہد میں ہوا ہے۔ قرآنی تصریح کے بعد مزید دلائل کی ضرورت نہیں۔

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ مناسبت کے سلسلہ میں جو کچھ تم نے کہا ہے اس سے اصل سوال تو حل نہ ہوا؟ واقعتاً ایسا ہی ہے لیکن جب مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں غور کیا جائے گا تو ہر شخص یہ تسلیم کرے گا کہ دنیا میں رحمت اور نقمت کے بے شمار مظاہر فرشتوں کے ہاتھوں ظہور میں آتے ہیں۔ فرشتے ہی تھے جو حضرت ابراہیم کے پاس پیام بشارت لائے تھے۔ اور یہی فرشتے قوم لوط کے لئے صاعقۂ ہلاکت ثابت ہوئے۔ اور یہی فرشتے تھے جو قرن اول میں حزب اللہ کے پہلو بہ پہلو حزب الشیطان سے برسرپیکار نظر آتے تھے۔ الغرض ملائکہ کے ہاتھوں دنیا میں جو رحمت و نقمت ظہور میں آتی ہے اس میں وحدانیت اور عدالت کبریٰ کے ثبوت پر کافی شہادت ہے۔ وہ اس طرح کہ ملائکہ کا پرستاران حق کے پہلو بہ پہلو احقاق حق اور استیصال باطل میں جد و جہد کرنا دلیل ہے اس امر پر کہ یہ کسی کے ماتحت ہیں اور یہ ان تمام لوگوں کے دشمن ہیں جو حدود اللہ سے سرکشی کرتے ہیں، اور ان لوگوں کے دوست ہیں جو خدا کی سرزمین پر رشد و ہدایت کی تبلیغ کرتے ہیں نیز یہ کہ فرشتوں کے کارناموں میں جو تضاد پایا جاتا ہے (یعنی مومنین کے ساتھ ان کی شفقت و ہمدردی خواہ ہاتھ سے ہو یا زبان سے اور کفار کے ساتھ ان کی تندی و سختی[1]) یہ شاہد ہے اس امر پر کہ ہو بہو یہی نقشہ (تفریق بین الصالح والمفسد) قیامت کے دن بھی پیش آئے گا۔

---

[1] قرآن مجید میں بیشمار ایسی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ متمردین کے حق میں بد دعا اور اظہار لعنت کرتے ہیں اور مومنین کے لئے بارگاہ الٰہی میں رحمت کی دعا کرتے ہیں اور ظن غالب یہ ہے کہ پیش نظر سورہ میں "فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا" سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

داؤد اکبر اصلاحی

رسائل و مسائل

صفاتِ باری تعالیٰ

لکھنؤ سے ایک صاحب لکھتے ہیں :۔

"میں ان لوگوں میں زندگی کے بہترین اوقات صرف کر رہا ہوں جو منکرِ مذہب ہیں اور تنہا وہی گمراہ نہیں ہیں بلکہ ہزاروں کو وہ گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ میں ان میں رہتا ہوں اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان تمام تر گمراہیوں کا منشا صرف دین سے ناواقفیت ہے اور بس۔

فضا اور ماحول کو دیکھتے ہوئے میرا دل بہترین توقعات سے لبریز ہے۔ میں کچھ کام کر چکا ہوں، کچھ کر رہا ہوں اور آئندہ بھی مجھے کچھ کرنا ہے۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ میں آپ کو اپنی امداد کے لئے تکلیف دینی چاہتا ہوں اس لئے کہ مجھے جو کام لینا ہے، آپ کے سوا اس کا کوئی دوسرا اہل نظر نہیں آتا۔

خدا کے وجود کا ہر شخص کو اعتراف ہے خواہ وہ کوئی مذہبی انسان ہو یا دہریہ، کوئی فاطر کہتا ہے اور کوئی فطرت۔ صرف الفاظ کے گورکھ دھندے ہیں، مفہوم سب کا واحد ہے لیکن مسلمان خدا کو "نانوے" صفات کے تسلیم کرتے ہیں۔

مجھے "وجود خدا باایں ہمہ صفات" کے دلائل درکار ہیں۔ ایک دلیل ہو یا چند دلائل ایسے ٹھوس اور مضبوط ہوں کہ انہیں "جدید روشنی" خیرہ نہ کر سکے، مختصر ہوں اور جامع ـــــ بس۔"

ترجمان القرآن۔ باری تعالیٰ کے ۹۹ اسماء تو وہ ہیں جو ہمیں بتائے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ

بے حد و حساب اسمارِ حسنیٰ اور بھی ہیں جن کا ہمیں علم نہیں۔ حدیث میں آیا ہے اسئلک بکل اسم ھولک وسمیت بہ نفسک او انزلتہ فی کتابک او استأثرت بہ فی علم الغیب عندک ؎۱ پس ۹۹ کی تخصیص درست نہیں۔

محض وجود باری کا اقرار صحت ایمان کے لئے کافی نہیں ہے۔ کم ازکم ان صفات کا علم و ادراک ضروری ہے جن کی تصریح قرآن میں ہے۔ مثلاً رب العلمین، رحمٰن، رحیم، سمیع، بصیر، خبیر، فعال لما یرید، دیان منتقم وغیرہ۔ اس لئے کہ صحتِ ایمان اور صحت عمل کا تمام تر انحصار اس امر پر ہے کہ خدا اور کائنات، اور خدا اور انسان کے تعلق کی حقیقی نوعیت ہمیں معلوم ہو، اور یہ اسمار صفات اسی نوعیت کو واضح کرتے ہیں۔ جو شخص مثلاً وجود باری کا مقر ہے مگر یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کائنات کو پیدا کرکے فارغ ہو بیٹھا ہے (نعوذ باللہ) اور اب اس کائنات کا نظم و نسق خود بخود بالاستقلال (INDEPENDENTLY) چل رہا ہے، اور اس کے انتظام سے بالفعل خدا کا فرمانروایانہ تعلق نہیں ہے، اس کا خدا کو ماننا بے معنی ہے۔ وہ گویا خدا کو اس طرح مانتا ہے جس طرح ایک موٹر خریدنے والا اس بات کو مانتا ہے کہ اس کا میکر فورڈ یا آسٹن ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ماننے سے موٹر کے ساتھ اس کا معاملہ اور برتاؤ معین یا کسی طور پر بھی متاثر نہیں ہوتا۔ اسی طرح محض یہ ماننے سے کہ کائنات کا اور خود انسان کا میکر خدا ہے، کائنات کے ساتھ اور خود اپنے وجود کے ساتھ انسان کے معاملہ کی نوعیت بھی معین نہیں ہوتی، نہ کسی طور پر متاثر ہوتی ہے۔ اسلام کا مقصود توصرف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب انسان اپنے ساتھ اور سارے عالم کے ساتھ باری تعالیٰ کے تعلق کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لے۔ اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ باری تعالیٰ قیوم ہے، فعال لما یرید ہے، رب ہے، علیم و خبیر ہے، قاہر فوق عبادہ ہے، ظالم نہیں ہے بلکہ رحمٰن و رحیم ہے، حکیم ہے (یعنی اس کا

؎۱ خدایا میں تجھ سے دعا کرتا ہوں ہر اس نام کے ساتھ جو تیرا ہے، جس سے تونے اپنے آپ کو موسوم کیا ہے، یا جسے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے، یا جو تیرے علم غیب میں ہے اور بندوں کو تونے اس کی خبر نہیں دی ہے۔

کوئی فعل عبث نہیں ہو سکتا) یوم الدین کا مالک ہے (یعنی اس کی عدالت میں ہم سب کو ایک روز حاضر ہونا اور اپنی دنیوی زندگی کا پورا حساب پیش کرنا ہے)، وغیر ذالک۔ یہ علم دنیا کی زندگی میں ہمارے طرز عمل کو کسی اور صورت سے معین کرے گا، اور اگر ہم اس علم سے خالی ہوں، یا اس علم میں نقص ہو تو ہمارا طرز عمل لازمی طور پر کوئی دوسری ہی صورت اختیار کرلے گا۔ مثلاً جو شخص نہیں جانتا کہ اس ملک کا کوئی بادشاہ ہے اس کا طرز عمل اس شخص سے مختلف ہوگا جو جانتا ہے کہ یہ ملک کسی بادشاہ کا ہے۔ اور جو شخص جانتا ہے کہ بادشاہ ہے مگر یہ سمجھتا ہے کہ وہ بے اختیار ہے، بالفعل حکمراں نہیں ہے، اپنے محل میں پڑا سوتا رہتا ہے، اور حقیقی حکمرانی کے اختیارات کچھ دوسرے لوگوں کو حاصل ہیں یا رعایا فرداً فرداً مختار ہے، اس کا طرز عمل اس شخص سے مختلف ہوگا جسے معلوم ہے کہ بادشاہ بالفعل حاکم ہے اور قادر مطلق ہے اور کوئی اس کی حکومت میں دخیل نہیں۔ اسی طرح جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ بادشاہ کے ہاں جانب داری (FAVOURITISIM) کا دور دورہ ہے اس کا طرز عمل کچھ اور ہوگا، اور جو یہ سمجھتا ہے کہ بادشاہ بے لاگ حکومت کرنے والا ہے، اور کسی کے ساتھ اس کا خصوصی تعلق نہیں ہے اس کا طرز عمل کچھ اور ہوگا۔ وقس علیٰ ہذا۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ باری تعالیٰ کی جو صفات ہم مانتے ہیں ان کے لئے دلیل کیا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اس کی دلیل اتنی روشن ہے کہ آنکھ کھولتے ہی نظر آسکتی ہے بشرطیکہ بینائی ہو اور بینائی کا رشتہ مرکز فہم و ادراک سے ٹوٹ نہ گیا ہو۔

آپکے سامنے ایک کرسی رکھی ہے۔ اس کا بنانے والا آپ کے سامنے نہیں ہے مگر آپ محض کرسی کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ اس کو بنانے والے میں حیات، قدرت، ارادہ، بصارت، حس، شعور، حکمت وغیرہ ضرور موجود ہوں گی ورنہ وہ اس کرسی کو نہیں بنا سکتا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ صانع کی صفات کو جاننے کے لئے اس کی صنعت کو دیکھنا اور غور کرنا کافی ہے۔ اب یہ عظیم الشان کارخانہ جس کا نام کائنات ہے

آپ کے سامنے کھلا ہوا ہے اور ہر آن نت نئی شان سے چل رہا ہے۔ اس کو دیکھئے اور اس میں تفکر کیجئے، آپ کا دل خود ہی گواہی دے گا کہ اس کے صانع میں فلاں اور فلاں صفات کا ہونا ضروری ہے۔ بعض صفات بالکل صریح طور پر اول نظر میں معلوم ہو جاتی ہیں، مثلاً ربوبیت، حکمت، علم، قدرت وغیرہ بعض صفات تھوڑے یا بہت تامل سے سمجھ میں آتی ہیں، مثلاً رحمانیت۔ اور بعض صفات ایسی ہیں جن کے متعلق مشاہدہ اور تفکر کے بعد بھی علم یقین حاصل نہیں ہوتا۔ اس علم یقین کے حصول کا ذریعہ نبی صادق کی خبر کے سوا کوئی نہیں۔ مثلاً باری تعالیٰ کا دیّان (جزا دینے والا) ہونا، کہ جب تک نبی صادق اس کی خبر نہ دے، بڑے سے بڑا صحیح الفکر آدمی بھی اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آثار کا مشاہدہ اور تفکر فی خلق السموات والارض زیادہ سے زیادہ اسے امکان دینونت تک، یا حد سے حد رجحان دینونت تک لے جا کر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ آفاق و انفس میں خدا کی کاریگری کے نشانات دیکھ کر اس حد تک تو کہہ سکے گا کہ ایسی حکمت کے ساتھ جس نے ہمیں بنایا ہے اس کا فعل عبث تو نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ اس زندگی کے ختم ہونے پر وہ ہمارے کارنامۂ حیات کا حساب لے اور جزا و سزا دے، اور اغلب ہے کہ ایسا ہو۔ لیکن اس اعتقاد کا جزم و یقین، اور حساب و کتاب کی کیفیت کا صحیح علم مجرّد تفکر سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے نبی کی ہدایت ناگزیر ہے۔

خطباتِ جمعہ

خطبۂ صیام

الحمد للہ، نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ۔ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا وسیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ واشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ۔ واشھد ان سیدنا محمداً عبدہ ورسولہ۔

ہر تعریف اللہ کے لئے ہے اور اللہ ہی کو پہنچتی ہے۔ ہم اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں، اسی سے مدد مانگتے ہیں، اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں، اس پر ایمان لاتے ہیں، اور اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہم کو خود اپنے نفس کی شرارتوں اور اعمال کی برائیوں سے بچائے۔ اللہ جس کو ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا، اور اللہ ہی جس کو ہدایت نہ دے اسے کوئی سیدھے رستے پر نہیں لگا سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اس اکیلے خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور کوئی اس کا شریک نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ ہمارے آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

برادرانِ اسلام! ہر کام جو انسان کرتا ہے، اس میں دو چیزیں لازمی طور پر ہوا کرتی ہیں۔ ایک چیز تو وہ مقصد ہے جس کے لئے کام کیا جاتا ہے، اور دوسری چیز وہ خاص صورتِ عمل ہے جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اختیار کی جاتی ہے۔ مثلاً کھانا کھانے کے فعل کو لیجئے۔ کھانے سے آپ کا مقصد زندہ

رہنا اور جسم کی طاقت کو بحال رکھنا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی صورت یہ ہے کہ آپ نوالے بناتے ہیں، منہ میں لے جاتے ہیں، دانتوں سے چباتے ہیں اور حلق کے نیچے اتارتے ہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سب سے زیادہ کارگر اور سب سے زیادہ مناسب طریقہ یہی ہو سکتا تھا، اس لئے آپ نے اسی کو اختیار کیا۔ لیکن آپ میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ اصل چیز وہ مقصد ہے جس کے لئے کھانا کھایا جاتا ہے، نہ کہ کھانے کے فعل کی صورت۔ اگر کوئی شخص لکڑی کا برادہ یا راکھ یا مٹی لے کر اس کے نوالے بنائے اور منہ میں لے جائے اور دانتوں سے چبا کر حلق کے نیچے اتار لے تو آپ اسے کیا کہیں گے؟ یہی نا کہ اس کا دماغ خراب ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ احمق کھانے کے اصل مقصد کو نہیں سمجھتا اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ بس فعل خوردن کے ان چاروں ارکان کو ادا کر دینے ہی کا نام کھانا کھانا ہے۔ اسی طرح آپ اس شخص کو بھی پاگل قرار دیں گے جو روٹی کھانے کے بعد فوراً ہی حلق میں انگلی ڈال کر قے کر دیتا ہو اور پھر شکایت کرتا ہو کہ روٹی کھانے کے جو فائدے بیان کئے جاتے ہیں وہ تو مجھے حاصل ہی نہیں ہوتے، بلکہ میں تو الٹا روز بروز دبلا ہوتا جا رہا ہوں اور مر جانے کی نوبت آ گئی ہے۔ یہ احمق اپنی اس کمزوری کا الزام روٹی اور کھانے پر رکھتا ہے، حالانکہ حماقت اس کی اپنی ہے۔ اس نے اپنی نادانی سے یہ سمجھ لیا کہ کھانے کا فعل جتنے ارکان سے مرکب ہے بس ان کو ادا کر دینے ہی سے زندگی کی طاقت حاصل ہو جاتی ہے، اس لئے اس نے سوچا کہ اب روٹی کا بوجھ اپنے معدے میں کیوں رکھو؟ کیوں نہ اسے نکال پھینکا جائے تاکہ پیٹ ہلکا ہو جائے، کھانے کے ارکان تو میں ادا کر ہی چکا ہوں۔ یہ احمقانہ خیال جو اس نے قائم کیا اور اس کی پیروی کی اس کی سزا بھی ظاہر ہے کہ اسی کو بھگتنی چاہئے۔ اس کو جاننا چاہئے تھا کہ جب تک روٹی پیٹ میں جا کر ہضم نہ ہو، اور خون بن کر سارے جسم میں پھیل نہ جائے، اس وقت تک زندگی کی طاقت حاصل نہیں ہو سکتی۔ کھانے کے ظاہری ارکان بھی اگرچہ ضروری ہیں، کیونکہ ان کے بغیر روٹی معدے تک نہیں پہنچ سکتی، مگر محض ان ظاہری ارکان سے کام نہیں چل سکتا۔ ان ارکان میں کوئی جادو بھرا ہوا نہیں ہے کہ انہیں ادا کرنے سے بس طلسماتی طریقہ پر آدمی کی رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہو۔ خون پیدا کرنے کے لئے تو اللہ نے

جو قانون بنایا ہے اسی کے مطابق وہ پیدا ہو گا۔ اس کو توڑو گے تو اپنے آپ کو خود ہلاک کرو گے۔

یہ مثال جو اس تفصیل کے ساتھ میں نے آپکے سامنے بیان کی ہے اس پر آپ غور کریں تو آپ کی سمجھ میں آسکتا ہے کہ آج آپ کی عبادتیں کیوں بے اثر ہو گئی ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی آپ سے بارہا بیان کر چکا ہوں سب سے بڑی غلطی یہی ہے کہ آپنے نماز روزے کے ارکان اور ان کی ظاہری صورتوں ہی کو اصل عبادت سمجھ رکھا ہے اور آپ اس خیال خام میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ جس نے یہ ارکان پوری طرح ادا کر دیے اس نے بس اللہ کی عبادت کر دی۔ آپ کی مثال اُس شخص کی سی ہے جو کھانے کے چاروں ارکان، یعنی نوالے بنانا، مُنہ میں رکھنا، چبانا، اور حلق کے نیچے اتار دینا، بس انہی چاروں کے مجموعے کو کھانا سمجھتا ہے، اور یہ خیال کرتا ہے کہ جس نے یہ چار ارکان ادا کر دیے اس نے کھانا کھا لیا اور کھانے کے فائدے اس کو حاصل ہونے چاہئیں، خواہ اس نے ان ارکان کے ساتھ مٹی اور پتھر اپنے پیٹ میں اتارے ہوں، یا روٹی کھا کر فوراً قے کر دی ہو۔ اگر حقیقت میں آپ لوگ اس حماقت میں مبتلا نہیں ہو گئے ہیں تو مجھے بتائیے یہ کیا ماجرا ہے کہ جو روزہ دار صبح سے شام تک برابر اللہ کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے وہ اس عبادت کی حالت میں جھوٹ کیسے بولتا ہے؟ غیبت کس طرح کرتا ہے؟ اس کی زبان سے گالیاں کیوں نکلتی ہیں؟ وہ عین عبادتِ الٰہی کی حالت میں لوگوں کے حق کیسے مار کھاتا ہے؟ حرام کھانے اور حرام کھلانے کے کام کس طرح کر لیتا ہے؟ اور پھر یہ سب کام کر کے بھی اپنے نزدیک یہ کیسے سمجھتا ہے کہ میں نے خدا کی عبادت کی ہے۔ کیا اس کی مثال اس شخص کی سی نہیں ہے جو راکھ اور مٹی کھاتا ہے اور محض کھانے کے چار ارکان ادا کر دینے کو سمجھتا ہے کہ کھانا اسی کو کہتے ہیں۔ پھر مجھے بتائیے یہ کیا ماجرا ہے کہ رمضان بھر میں تقریباً ۳۶۰ گھنٹے خدا کی عبادت کرنے کے بعد جب آپ فارغ ہوتے ہیں تو اس پوری عبادت کے تمام اثرات شوال کی پہلی تاریخ ہی کو کافور ہو جاتے ہیں۔ ہندو اپنے تہواروں میں جو کچھ کرتے ہیں وہی سب آپ عید کے زمانے میں کرتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ شہروں میں تو عید کے روز بدکاری اور شراب نوشی اور

قمار بازی تک ہوتی ہے۔ اور بعض ظالم تو میں نے ایسے دیکھے ہیں جو رمضان کے زمانے میں دن کو روزہ رکھتے ہیں اور رات کو شراب پیتے اور زنا کاری کرتے ہیں۔ عام مسلمان خدا کے فضل سے اس قدر بگڑے ہوئے تو نہیں ہیں، مگر رمضان ختم ہونے کے بعد آپ میں سے کتنے ایسے ہیں جن کے اندر عید کے دوسرے دن بھی تقویٰ اور پرہیزگاری کا کوئی اثر باقی رہتا ہو؟ خدا کے قوانین کی خلاف ورزی میں کونسی کسر اٹھا رکھی جاتی ہے؟ نیک کاموں میں کتنا حصہ لیا جاتا ہے؟ اور نفسانیت میں کیا کمی آجاتی ہے؟ سوچئے اور غور کیجئے کہ اس کی وجہ آخر کیا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ کے ذہن میں عبادت کا مفہوم اور مطلب ہی غلط ہو گیا ہے۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ سحر سے لے کر مغرب تک کچھ نہ کھانے اور نہ پینے کا نام روزہ ہے اور بس یہی عبادت ہے۔ اس لئے روزے کی تو آپ پوری حفاظت کرتے ہیں۔ خدا کا خوف آپ کے دل میں اس قدر ہوتا ہے کہ جس چیز میں روزہ ٹوٹنے کا ذرا سا اندیشہ بھی ہو اس سے بھی بچتے ہیں۔ اور اگر جان پر بھی بن جائے تب بھی آپ کو روزہ توڑنے میں تامل ہوتا ہے۔ لیکن آپ نہیں جانتے کہ یہ بھوکا پیاسا رہنا اصل عبادت نہیں بلکہ عبادت کی صورت ہے۔ اور یہ صورت مقرر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ آپ کے اندر خدا کا خوف اور خدا کی محبت پیدا ہو، اور آپ کے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ جس چیز میں دنیا بھر کے فائدے ہوں مگر خدا ناراض ہوتا ہو اس سے آپ اپنے نفس پر جبر کر کے بچ سکیں، اور جس چیز میں طرح طرح کے خطرات اور نقصانات ہوں مگر خدا اس سے خوش ہوتا ہو، اس پر آپ اپنے نفس کو مجبور کر کے آمادہ ہو سکیں۔

یہ طاقت اسی طرح پیدا ہو سکتی تھی کہ آپ روزے کے مقصد کو سمجھتے اور مہینہ بھر تک اپنے خدا کے خوف اور خدا کی محبت میں اپنے نفس کو خواہشات سے روکنے اور خدا کی رضا کے مطابق چلانے کی جو مشق کی ہے اس سے کام لیتے۔ مگر آپ تو رمضان کے بعد ہی اس مشق کو اور ان صفات کو جو اس مشق سے پیدا ہوتی ہیں اس طرح نکال پھینکتے ہیں جیسے کھانا کھانے کے بعد کوئی شخص انگلی ڈال کر قے کر دے۔ بلکہ آپ میں سے بعض لوگ تو روزہ کھولنے کے بعد ہی دن بھر کی پرہیزگاری کو اگل دیتے ہیں۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ رمضان اور اس کے روزے کوئی

طلسم تو نہیں ہیں کہ بس ان کی ظاہری شکل پوری کر دینے سے آپ کو وہ طاقت حاصل ہو جائے جو حقیقت میں روزے سے حاصل ہونی چاہئے۔ جس طرح روٹی سے جسمانی طاقت اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ معدے میں جا کر ہضم نہ ہو اور خون بن کر جسم کی رگ رگ میں نہ پہنچ جائے، اسی طرح روزے سے بھی روحانی طاقت اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ آدمی روزہ کے مقصد کو پوری طرح سمجھے نہیں اور اپنے دل و دماغ کے اندر اس کو اترنے اور خیال، نیت، ارادہ اور عمل سب پر چھا جانے کا موقع نہ دے۔

یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کا حکم دینے کے بعد فرمایا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ یعنی تم پر روزہ فرض کیا جاتا ہے، شائد کہ تم متقی و پرہیز گار بن جاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ اس سے تم ضرور متقی و پرہیز گار بن جاؤ گے۔ اس لئے کہ روزے کا یہ نتیجہ تو آدمی کی سمجھ بوجھ اور اس کے ارادے پر موقوف ہے۔ جو اس کے مقصد کو سمجھے گا اور اس کے ذریعہ سے اصل مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرے گا وہ تو تھوڑا یا بہت متقی بن جائے گا۔ مگر جو مقصد ہی کو نہ سمجھے گا اور اسے حاصل کرنے کی کوشش ہی نہ کرے گا اسے کوئی فائدہ حاصل ہونے کی امید نہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے روزے کے اصل مقصد کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور یہ سمجھایا ہے کہ مقصد سے غافل ہو کر بھوکا پیاسا رہنا کچھ مفید نہیں۔ چنانچہ فرمایا:-

من لم یدع قول الزور والعمل به فلیس للہ حاجۃ فی ان یدع طعامہ وشرابہ	جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اس کا کھانا اور پانی چھڑوا دینے کی اللہ کو کوئی حاجت نہیں ہے۔

دوسری حدیث میں ہے کہ سرکار نے فرمایا:-

کم من صائم لیس لہ من صیامہ الا الظمأ وکم من قائم لیس لہ من قیامہ الا السھر۔	بہت سے روزہ دار ایسے ہیں کہ روزے سے بھوک پیاس کے سوا ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ اور بہت سے راتوں کو کھڑے رہنے والے ایسے ہیں کہ اس قیام سے رت جگے کے سوا ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔

ان دونوں حدیثوں کا مطلب بالکل صاف ہے۔ ان سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ محض بھوکا اور

پیاسا رہنا عبادت نہیں ہے، بلکہ اصل عبادت کا ذریعہ ہے، اور اصل عبادت ہے خوف خدا کی بنا پر اس کے قانون کی خلاف ورزی سے بچنا، اور محبت الٰہی کی بنا پر ہر اس کام کے لئے شوق سے لپکنا جس میں محبوب کی خوشنودی ہو، اور نفسانیت سے بچنا جہاں تک بھی ممکن ہو۔ اس عبادت سے جو شخص غافل رہا اس نے خواہ مخواہ اپنے پیٹ کو بھوک پیاس کی تکلیف دی۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی حاجت کب تھی کہ بارہ چودہ گھنٹے کے لئے اس سے کھانا پینا چھڑوا دیتا۔

روزے کے اصل مقصد کی طرف سرکار اس طرح توجہ دلاتے ہیں کہ :۔

مَن صامَ رمضانَ ایمانًا واحتسابًا غُفِرَ لهٗ ما تقدّمَ من ذنبِهٖ

جس نے روزہ رکھا ایمان اور احتساب کے ساتھ اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیئے گئے۔

ایمان کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے متعلق ایک مسلمان کا جو عقیدہ ہونا چاہئے وہ عقیدہ ذہن میں پوری طرح تازہ رہے۔ اور احتساب کا یہ مطلب ہے کہ آدمی ہر وقت اپنے خیالات اور اپنے اعمال پر نظر رکھے کہ کہیں وہ اپنے ایمان کے خلاف تو نہیں چل رہا ہے۔ ان دونوں چیزوں کے ساتھ جو شخص رمضان کے پورے روزے رکھے گا وہ اپنے پچھلے گناہ بخشوا لے جائے گا اس لئے کہ اگر وہ کبھی سرکش و نافرمان بندہ تھا بھی تو اب اس نے اپنے مالک کی طرف پوری طرح رجوع کر لیا، اور التائب من الذنب کمن لا ذنب له۔

دوسری حدیث میں آیا ہے :۔

الصیام جُنّةٌ واذا کان یومُ صومِ احدِکم فلا یرفُثْ ولا یصخَبْ۔ فانْ سابّهٗ احدٌ او قاتلهٗ فلیقُلْ انی امرؤٌ صائمٌ

روزے ڈھال کی طرح ہیں کہ جس طرح ڈھال دشمن کے وار سے بچنے کے لئے ہے اسی طرح روزہ بھی شیطان کے وار سے بچنے کے لئے ہے۔ لہٰذا جب کوئی شخص روزے سے ہو تو اسے چاہئے کہ اس ڈھال کو استعمال کرے اور دنگے فساد سے پرہیز کرے۔ اگر کوئی اس کو گالی دے یا اس سے لڑے تو اس کو کہہ دینا چاہئے کہ بھائی میں روزے سے ہوں۔ مجھ سے تم یہ توقع نہ رکھو کہ تمہارے اس مشغلہ میں حصہ لوں گا

دوسری احادیث میں حضور نے بتایا ہے کہ روزے کی حالت میں آدمی کو زیادہ سے زیادہ نیک کام کرنے چاہئیں اور ہر بھلائی کا شوقین بن جانا چاہئے۔ خصوصاً اس حالت میں اس کے اندر اپنے دوسرے بھائیوں کی ہمدردی کا جذبہ تو پوری شدت کے ساتھ پیدا ہو جانا چاہئے، کیونکہ وہ خود بھوک پیاس کی تکلیف میں مبتلا ہو کر زیادہ اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے کہ دوسرے بندگانِ خدا پر غریبی اور مصیبت میں کیا گزرتی ہوگی۔ حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ خود سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں عام دنوں سے زیادہ رحیم اور شفیق ہو جاتے تھے۔ کوئی سائل اس زمانے میں حضور کے دروازے سے خالی نہ جاتا۔ اور کوئی قیدی اس زمانے میں قید نہ رہتا تھا۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضور نے فرمایا۔

من فطر فیه صائمًا کان له مغفرةً لذنوبه وعتق رقبته من النار وکان له مثل اجرہٖ من غیر ان ینتقص من اجرہٖ شیٔ۔	جس نے رمضان میں کسی روزہ دار کو افطار کرایا تو یہ اس کے گناہوں کی بخشش کا اور اس کی گردن کو آگ سے چھڑانے کا ذریعہ ہوگا اور اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا اس روزہ دار کو روزہ رکھنے کا ثواب ملے گا۔

خطبۂ ثانیہ الحمد للہ العلی العظیم والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم۔

معاشر مسلمین! اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان ہم پر یہ ہے کہ اس نے ہم کو اسلام کی نعمت سے نوازا، اور اسلام کی نعمت ہم کو جس ذریعہ سے پہنچی ہے وہ اللہ کے رسول برحق کی ذات ہے۔ لہٰذا جس طرح ہم پر اللہ کا شکر اور اس کی حمد و ثنا واجب ہے، اسی طرح اللہ کے رسول پر صلوٰۃ و سلام بھیجنا بھی واجب ہے۔ اللّٰھمّ صل علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم انك حمید مجید۔ اس کے بعد ہمیں دعائے رحمت کرنی چاہئے حضور کے اصحاب و اہل بیت پر، اور خصوصاً آپ کے خلفائے راشدین حضرات ابوبکر صدیق وعمر بن الخطاب وعثمان ابن عفان وعلی ابن ابی طالب پر کہ یہی حضرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح پیروی کر کے ہمارے لئے ایک روشن راستہ چھوڑ گئے ہیں۔

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ۔

اس کے بعد دعا کیجئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہم کو راہِ راست پر قائم رکھے اور گمراہی سے بچائے۔ خدایا ہمیں حق کو حق کر کے دکھا اور اس کی پیروی کی توفیق دے۔ اور ہمیں باطل کو باطل کر کے دکھا اور اس سے بچنے کی توفیق دے۔ خدایا جو تیرے دین کی مدد کرے تو اس کی مدد کر اور ہمیں اس کا ساتھی بنا۔ اور جو تیرے دین سے مُنہ پھیرے تو بھی اس سے منہ پھیر لے اور ہمیں اس کے فتنہ میں پڑنے سے بچا۔ خدایا! دنیا میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ بر و بحر میں فساد پھوٹ پڑا ہے، ایک تلاطم ہے جس میں تیرا نام لینے والوں کی ٹوٹی ہوئی کشتی تھپیڑے کھا رہی ہے۔ خدایا! تو ہی ہم کو علم کا نور دینے والا ہے کہ سیدھا راستہ دیکھ سکیں اور تو ہی ہمیں طاقت بخشنے والا ہے کہ اس طوفان سے صحیح و سالم بچ کر نکل سکیں۔ خدایا! تیرا ہی وعدہ ہے کہ اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ۔ لہٰذا ہم تجھ سے دعا کرتے ہیں اور تو اسے قبول کر! رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔

عباد اللہ! انّ اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشآء والمنکر والبغی۔ یعظکم لعلکم تذکرون۔ اذکروا اللہ یذکرکم وادعوہ یستجب لکم۔ ولذکر اللہ تعالیٰ اعلیٰ واولیٰ واعز واجل واھم واتم واقویٰ واکبر۔

مطبوعات

مقالاتِ شبلی حصہ چہارم، حصہ پنجم حصہ ششم، حصہ ہفتم

تالیفات مولانا شبلی مرحوم۔ ضخامت بالترتیب ۱۸۹، ۱۳۸، ۲۴۰، ۲۴۰، ۲۰۰ صفحات قیمت عہ، عہ، عہ، عہر ملنے کا پتہ:۔ دار المصنفین اعظم گڈھ۔

مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے مستقل تصانیف کے علاوہ مختلف عنوانوں پر متعدد مضامین نکلے تھے، جن میں سے اکثر الندوہ میں شائع ہوئے تھے۔ مولانا مرحوم کا محققانہ اصول نگارش جس طرح ان کی مستقل تصنیفات میں نمایاں ہے، اسی طرح ان کے متفرق مضامین میں بھی موجود ہے۔ ادارہ دار المصنفین، جو مرحوم ہی کی یادگار ہے، ان قابل قدر علمی جواہر پاروں کو جو مختلف مقامات میں بکھرے پڑے تھے حسن ترتیب کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کر رہا ہے۔ اب تک اس سلسلہ کی سات جلدیں نکل چکی ہیں۔ آخر کی چار جلدیں اس وقت زیر تبصرہ ہیں۔

حصہ چہارم تنقیدی مباحث پر مشتمل ہے۔ سترہ کتابوں پر تفصیلی تبصرے ہیں۔ ان کتابوں میں اکثر وہ بلند پایہ اسلامی تصنیفات ہیں جو آج یورپ کی بدولت ہر گلی کوچے میں پھیل چکی ہیں، لیکن نصف صدی پیشتر تک خود مسلمان ان کے نام سے بھی بہت کم واقف تھے۔ اگرچہ ان مقالات کی حیثیت محض تبصروں کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بجائے خود مفید، مدلل اور پر از معلومات مضامین ہیں۔ اور مولانا کا کمال خاص یعنی ان کا ذوق تنقیدی تو ایک ایک فقرہ میں جھلک رہا ہے۔ بالخصوص "تمدن اسلام" کے مصنف جرجی زیدان نے اپنی کتاب میں جن متعصبانہ عیاریوں سے اسلام کی مدح کے پردہ میں تنقیص کی تھی، اور جس کی نظر فریبی اچھے اچھے

دیدہ وروں کو چرکا دے گئی تھی، ان کی پردہ دری نہایت بالغ نظری سے کی گئی ہے۔

حصّہ پنجم تاریخ وسیر سے متعلق ہے۔ اس میں مشاہیر اسلام کے سوانح حیات ہیں۔ تاریخ مولانا مرحوم کا خاص فن تھا، اس لئے ان مضامین کی نسبت کسی تفصیلی اظہار رائے کی ضرورت نہیں۔ معتزلہ اور اعتزال کی تاریخ بیان کرتے ہوئے جگہ جگہ مصنف نے "اعتزال" کو "عقلیت" سے تعبیر کیا ہے مگر یہ تعبیر ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اعتزال کو نہ تو خالص اسلامی عقلیت کہا جا سکتا اور نہ یونانی۔ بلکہ یہ بین بین کی ایک خام فلسفیت ہے جس میں ایک طویل عرصہ تک مسلمان معقولیین اس وقت تک بھٹکتے رہے جب تک علوم عقلیہ نے ان کے اندر پختگی حاصل نہ کرلی۔ قریبی دور میں جس طرح یورپ کے علوم عقلیہ کی نئی نئی چمک دیکھ کر ہماری آنکھیں خیرہ ہوئی تھیں، اور اب آہستہ آہستہ ان علوم کی گہرائیوں تک پہنچ کر یہ خیرگی دور ہو رہی ہے، اسی طرح ابتدائی زمانہ میں بھی جب مسلمان نئے نئے فلسفۂ یونان وعجم سے واقف ہوئے تھے تو ان پر یہی خیرگی کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی، اور وہ کہیں صدیوں میں جا کر دور ہوئی۔ لہٰذا اگر نئے دور کے اعتزال کو حقیقی معنوں میں "عقلیت" سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا تو پرانے زمانے کا اعتزال بھی اس نام کا مستحق نہیں۔

اسی طرح ایک موقع پر ضمناً مصنف کے بعض بیانات سے اس خیال کی تائید نکلتی ہے کہ اسلامی علوم کا اصلی سرچشمہ یونانی زبان ہے ہمیں اس عمومی فیصلہ کے تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ارتقاء تہذیب کی تاریخ میں ہر بعد کی قوم نے پہلے کی قوموں کے کارناموں سے استفادہ کیا ہے اور یہ استفادہ کوئی عیب نہیں ہے۔ مسلمانوں نے بھی جب اس راہ میں قدم رکھا تو اقوام قدیمہ کے کارناموں سے استفادہ کیا۔ مگر مسلمانوں کا اصلی عطیہ (CONTRIBUTION) جس نے افکار انسانی کی رَو کو خیالیت سے واقعیت کی طرف پھیر دیا، اور خرص و تخمین سے ہٹا کر تحقیق کی طرف متوجہ کیا، اس کا سرچشمہ بجز قرآن حکیم کے کوئی نہیں۔ اس کا نشان ان سے پہلے کی کسی قوم کے علوم میں نہیں ملتا۔

حصّہ ششم بھی تاریخی مقالات کا مجموعہ ہے، جن میں عام تاریخی مباحث پر سیر حاصل بحثیں کی گئی ہیں۔

یونانی، فارسی، ہندی وغیرہ غیر زبانوں کا قدیم لٹریچر جس طرح عربی زبان کے دامن میں آکر مسلمانوں کے ہاتھوں زندۂ جاوید ہوگیا، اس کی مفصل تاریخ ۱۱۲ صفحوں میں موجود ہے۔ اس سے مسلمانوں کی علم دوستی اور غیر عربی علوم کے ساتھ غیر متعصبانہ رغبت و اعتنا، کا حال معلوم ہوسکتا ہے۔ یورپ کی ان افترا پردازیوں میں سے جنھیں اس کے متعصب دماغ نے گھڑ کر مسلمانوں کو بدنام کیا ہے، ایک کتب خانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کا واقعہ بھی ہے۔ مولانا مرحوم نے اس سراپا غلط الزام کی پوری قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ اس مجموعہ میں سات مباحث ہیں اور ساتوں اسلامی تاریخ کی جان ہیں۔

جلد ہفتم میں فلسفیانہ مقالے ہیں۔ مسلمانوں کے متعلق یورپین ججوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ فلسفہ میں ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے، فلسفۂ یونان کی کورانہ تقلید ان کے فلسفہ کا آخری زینہ ہے۔ مولانا نے تاریخی حقائق سے اس بے بنیاد ادّعا کی تردید کی ہے، اور بتایا ہے کہ مسلمانوں نے فلسفۂ یونان کو کس طرح محفوظ کیا؟ اس میں کیا اصلاح و ترمیم کی؟ اس پر کس قدر اضافے کئے؟ اس کے ساتھ انھوں نے خود یونانی منطق پر ـــ جس کے ساتھ ہمارے علما اب تک چمٹے ہوئے ہیں ـــ مجتہدانہ تنقید کرکے اس کی غلطیاں دکھائی ہیں، اور بتایا ہے کہ فلسفۂ اسلام، فلسفۂ یونان اور فلسفۂ جدیدہ کا درمیانی واسطہ ہے یا یوں کہنا چاہیئے کہ اسلامی فلسفہ ہی نے حکمتِ یونان کو ترقی کی منزلیں طے کرا کے اس مقام تک پہنچایا جہاں سے فلسفۂ حال کی داغ بیل پڑی۔

فلسفہ کے مختلف ادوار و مدارج کے متعلق مصنف کا یہ ریمارک یہاں تک تو بالکل واقعیت پر مبنی ہے لیکن اس کے بعد انھوں نے جو قدم اٹھایا ہے اس میں جگہ جگہ فلسفۂ یورپ کے مقابلہ میں اس ذہنی مرعوبیت کے آثار دکھائی دیتے ہیں جو انیسویں صدی کے آخر میں تمام مسلمانوں پر چھا گئی تھی۔ بلاشبہ یورپین فلسفہ کی ابتدا اسلامی فلسفہ کی دست نگر ہے مگر آج وہ اپنی انتہا کو پہنچ کر اسلام سے اسی قدر دور ہوچکا ہے جس قدر یونانی فلسفہ تھا، بلکہ اصول و مبادی کے لحاظ سے اس سے بھی زیادہ۔ حکمتِ جدیدہ

کا نقطۂ آغاز خدا کو نہ ماننے کی خواہش ہے جو بجائے خود کسی علمی استدلال پر مبنی نہیں ہے بلکہ ایک بگڑی ہوئی ذہنیت اور ایک بھٹکے ہوئے رجحان نفس پر مبنی ہے۔ معقولات خالصہ ہوں یا نظری سائنس، دونوں کی بنیاد یہی چیز ہے، اور اسی خشتِ اوّل کی کجی نے ثریا تک اس دیوار کو کج کر کے رکھ دیا ہے۔ ڈارون کی تھیوری بھی جس کی مصنف نے دبی زبان سے تائید کی ہے درحقیقت اسی بنیاد پر مبنی ہے۔ اس نے آثار کائنات کا مشاہدہ اس مفروضہ کے ساتھ کیا کہ اس نظام کا کوئی بنانے اور چلانے والا نہیں ہے، اور پھر اس خواہش کے ساتھ تحقیق شروع کی کہ ایک صانع حکیم کے بغیر اس نظام کے چلنے کا معمہ حل کیا جائے، لہٰذا تمام علمی حقائق (SCIENTIFIC FACTS) جو اس کے سامنے آئے ان کو اس نے اس طور پر مرتب کر دیا کہ ان سے انواع کے خود بخود ایک نوع سے دوسری نوع میں تبدیل ہونے اور ترقی کرنے کا نتیجہ برآمد ہو۔ یہ نتیجہ بجائے خود علمی حقیقت نہیں ہے، بلکہ حقائق کی اس ترتیب سے پیدا ہوتا ہے جو خدا کو نہ ماننے کی مجرد خواہش پر مبنی ہے۔ مولانا مرحوم نے ڈارون کی تھیوری کو محض ارتقاء کی تھیوری سمجھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ حکمائے اسلام بھی اس کے قائل تھے۔ مگر شاید یہ بات مرحوم کے علم میں نہ آئی کہ ڈارون کا اصلی کام نفس ارتقاء کا اثبات نہیں ہے بلکہ اس امر کا ادعا ہے کہ تنازع للبقاء اور انتخاب طبیعی اور بقائے اصلح کے قوانین کے تحت انواع خود بخود ایک دوسرے میں تبدیل ہوتی اور ترقی کرتی ہیں۔ حکمائے اسلام میں سے اس چیز کا نہ کوئی قائل ہوا، نہ کسی خدا پرست کا ذہن اس نظریہ کی طرف منتقل ہو سکتا ہے۔ اور نہ خود ڈارون اس کو علمی حقیقت ثابت کر سکا ہے۔ وہ جو کچھ علمی طور پر ثابت کر سکا ہے وہ صرف یہ ہے کہ عالم طبیعی میں یہ قوانین کام کر رہے ہیں، اور یہ کہ انواع میں ترتیب صعودی پائی جاتی ہے۔ رہا یہ کہ ان قوانین کے تحت نوع سافل سے نوع عالی کی طرف خود بخود صعود ہوتا ہے، تو یہ مجرد قیاس ہے۔ سائنٹفک حقیقت ثابت نہیں ہو سکا۔

قادیانی مذہب | تالیف جناب سلاح الدین محمد الیاس صاحب برنی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی علیگ ناظم سررشتہ تالیف و ترجمہ حیدرآباد۔ ضخامت ۱۱۰۰ صفحات، قیمت ۳؎، ملنے کا پتہ :۔ تاج کمپنی لاہور۔

ناظرین ترجمان القرآن اس کتاب کے نام سے ناواقف نہیں ہیں۔ ہم اس کے گذشتہ ایڈیشنوں پر برابر تبصرہ کرتے رہے ہیں۔ اب اسی کتاب کا پانچواں ایڈیشن شائع ہوا ہے جس میں کثرت سے نئے مباحث اور حوالجات اضافہ کئے گئے ہیں۔ اور ان تمام قادیانی کتابوں کا جواب دے دیا گیا ہے جو اس کتاب کے سابقہ ایڈیشنوں کے رد میں شائع کی گئی ہیں۔ کتاب کی جامعیت، ترتیب کی خوبی، طرز بیان کی سرشگفتگی اور طریقۂ افہام و تفہیم کی جدت کا صحیح اندازہ پڑھنے ہی پر موقوف ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں قادیانیت اور بانی قادیانیت کا ایک ایک خط و خال بے حجاب نظر آتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس کتاب میں جو کچھ کہا گیا ہے، مرزا صاحب اور ان کے اصحاب کی زبان ہی سے کہا گیا ہے۔ یعنی قادیانیت کی کہانی خود اپنی زبانی ہے۔ قادیانیت گو اپنی موت آپ مررہی ہے، پھر بھی ضرورت ہے کہ بے خبر مسلمانوں میں یہ کتاب کثرت سے پہنچے، اور لوگ اس فتنہ سے پرحذر رہیں۔ ہم خود اس فرقہ کے حق طلب طبقہ کی خدمت میں بھی مخلصانہ عرض کرتے ہیں کہ تعصب سے بالاتر ہو کر اس کتاب کو پڑھے۔ لعلّ اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔

قادیانی قول و فعل — تالیف جناب پروفیسر سلاح الدین محمد الیاس صاحب برنی۔ ضخامت ۳۹۲ صفحات۔ قیمت ۱۲/ ملنے کا پتہ:- تاج کمپنی لاہور۔

اس کتاب کو کتاب "قادیانیت" کا تتمہ یا تشریحی خلاصہ کہنا چاہئیے جو "قادیانی مذہب" کے جواب "بشارتِ احمد" کی تنقیح کے سلسلہ میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب بھی اسی متانت، جامعیت اور تحقیق کی حامل ہے جس کی مولف سے توقع کی جاسکتی ہے۔ اس میں ان تمام عذرات اور بیجا تاویلات کا تشفی بخش جواب دے دیا گیا ہے جنھیں جناب بشارت احمد صاحب قادیانی نے اپنی کتاب میں پیش کیا تھا۔ قادیانی تحریک کی تدریجی قلابازیاں، قادیانی قول و فعل کی مبہم اور مغالطہ آمیز دورنگی، اور احمدیت کی اسلام کے خلاف خطرناک روش بلکہ سازش کا حال جن لوگوں کو نہ معلوم ہو وہ لوگ "قادیانی مذہب" کے ساتھ ساتھ اس کتاب کا بھی مطالعہ کریں۔ ان دونوں کتابوں میں فاضل مؤلف نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا ہے کہ امت قادیان کے ہاتھوں

میں اس کا اعمال نامہ۔ کامل اور مکمل اعمالنامہ جسے اس نے اپنے ہی قلم سے مرتب کیا ہے ۔۔۔ دیدیا ہے، اور صرف اتنی گذارش کی ہے کہ اِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا۔ کیا قادیانی حضرات اس گذارش پر توجہ کریں گے ؟۔

ترجمان مرتبہ سید معین الدین صاحب ایم اے۔ ضخامت ۳۲ صفحات، شرح چندہ سالانہ ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ انجمن اتحادیہ مہاجرین بخارا و ترکستان گلی پہاڑی درزیاں، چتلی قبر، دہلی۔

روسی مظالم سے تنگ آکر بخارا اور ترکستان کے مسلمان دنیا کے مختلف ممالک میں ہجرت کر رہے ہیں۔ اب تک تقریباً پچاس لاکھ مہاجرین اپنی متاعِ ایمان کی خاطر اپنے وطن کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ ان میں سے ایک قافلہ ۱۰ اپریل ۱۹۳۷ء سے ہندوستان بھی آیا ہوا ہے۔ دہلی میں ان مہاجرین نے اپنی تنظیم کے لئے "انجمن اتحادیہ" کی بنا ڈالی ہے یہ ماہنامہ اسی انجمن کا آرگن ہے، جو چند ماہ سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ بعض مفید علمی و اصلاحی مضامین کے علاوہ جو چیز خاص طور سے قابل توجہ ہے وہ اشتراکی روس کی ہلاکت آفرینیوں اور فرزندانِ توحید کی خانہ بربادیوں کا وہ دل دوز مرقع ہے جسے یہ ستم زدہ مہاجرین اپنے قلم سے کھینچ رہے ہیں۔ دردمند مسلمانوں کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اس رسالہ کی صدا زیادہ سے زیادہ کانوں تک پہنچائیں تاکہ ان فریب خوردوں کی آنکھوں سے پردہ ہٹ جائے جو اشتراکی نظام کو دنیا کے لئے رحمت سمجھ رہے ہیں اور جنھیں سویٹ روس کا جہنم زار جنت نشان نظر آرہا ہے۔ اس وقت انہیں معلوم ہوگا کہ ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے وہ جس نظام کی عدل پروری اور انسانیت نوازی کا دن رات قصیدہ پڑھا کرتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے اور جنھوں نے عملاً اسے دیکھا، بھگتا اور چکھا ہے وہ اس کا کیا حال بیان کرتے ہیں۔ توقع ہے کہ مسلمانانِ ہند اپنے مظلوم بھائیوں کے تجربہ اور مشاہدہ سے فائدہ اٹھائیں گے اور اشتراکی زہر کو اسلامی تریاق سمجھنے کی خطرناک غلطی نہ کریں گے۔ اس رسالہ میں روسی اور اشتراکی نظام کے متعلق جو کچھ شائع ہو رہا ہے نہ تو وہ کوئی پروپگنڈا ہے اور نہ اختلافِ نظریات کا اثر ہے بلکہ یہ لوگ خود گھر کے

بھیدی ہیں، جیسا کچھ علمی دنیا میں انھوں نے اس نظام کو پایا ہے، بے کم و کاست بیان کر رہے ہیں۔ اس رسالہ کی توسیع اشاعت نہ صرف اخلاقی و علمی بلکہ دینی خدمت ہے فَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی۔

اگرچہ ان مہاجرین کو ہندوستان آئے ہوئے ابھی کل سال ڈیڑھ سال ہوئے ہیں لیکن انھوں نے اردو ادب میں حیرت انگیز مہارت پیدا کرلی ہے۔ اس لئے رسالہ کی ادبیت بھی زیادہ "بدیسی" نہیں ہے ہمارے ترک بھائیوں کے لئے اسلام کی قومیت اور ملیت کافی ہے انھیں "چنگیز" جیسے فاتحوں پر فخر کرنے کی ضرورت نہیں۔

قائد مرتبہ مولوی سید اختر اسلام صاحب قاسمی۔ ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت سالانہ عمدہ کاغذ ۱۲؍ معمولی کاغذ عہ۔ پتہ :۔ مولانا حکیم انظار احمد صاحب محلہ فیل خانہ، مراد آباد (یوپی)

یہ ایک علمی، مذہبی اور اقتصادی ماہنامہ ہے جو بعض اکابر دیوبند کی سرپرستی میں مراد آباد سے شائع ہو رہا ہے۔ رسالہ کی جامعیت قابل قدر ہے۔ اس کا نصب العین خود اسی کے لفظوں میں آنحضرت صلعم اور صحابہ کرام کے حالات پیش کرکے مسلمانوں کی اصلاح کرنا اور فلسفہ عروج و زوال پر بحث کرکے جذبات مسلم کو ابھارنا ہے، آخر میں ایک مضمون عربی زبان میں بھی شائع ہو رہا ہے۔ بہت سے مفید مضامین مسلسل شائع کئے جا رہے ہیں۔ سیاسی مباحث بھی موجود ہیں مگر افسوس کہ کبھی کبھی متانت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ بھی جاتا ہے۔ ایک ایسے رسالہ کو جو اسلامی تہذیب کا علمبردار اور "انسائیکلوپیڈیا" ہونے کا داعیہ رکھتا ہو کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ عام اخباری لب و لہجہ اختیار کرے۔ مخالف بر سر غلط سہی لیکن لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ کی تعلیم غلط نہیں۔

فردوس مرتبہ جناب حبیب اشعری صاحب دہلوی، ضخامت ۳۲ صفحات، قیمت عہ ملنے کا پتہ :۔ دفتر رسالہ فردوس، دہلی

سال رواں کے جدید ادبی ماہناموں اور شعر و ادب کے ممتاز خدمت گذاروں میں سے ہے۔

افسانے معیاری اور نتیجہ خیز ہیں "جبل القمر" کے عنوان سے جو افسانہ شائع ہوا ہے اس کی تلخ نگاری کچھ پسندیدہ نہیں۔ علماء سو کی بے اعتدالیوں کا ہم انکار نہیں کرتے مگر علماء کی پوری جماعت کو عمومی حیثیت سے اس بے اعتدالی کا مجرم کیوں ٹھہرایا جائے، اور وہ بھی ایسے غیر مہذب و سخیف انداز میں۔

کانگریس یا مسلم لیگ تالیف جناب حکیم انصاری صاحب، ضخامت ۴۰ صفحات، قیمت ۲ر

ملنے کا پتہ :- ناظم دار الاشاعت سیاسیات مشرقیہ - آفندی لاج - قرولباغ - نئی دہلی۔

مسلمانوں کی جہالت اور مفلوج ذہنیت سے یورپ ایک مدت سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ہندی سیاست کے موجودہ انقلاب میں ہندو بھی مسلمانوں کے متعلق اسی داؤ سے کام لینا چاہتا ہے بلکہ کانگریس کے اسلحہ خانہ سے اس کا استعمال بھی شروع کر چکا ہے اور مسلم قوم ہے کہ ابھی تک کانگریس کے متعلق ہی طے نہیں کر سکی کہ اس میں مسیحائیت ہے یا دجالیت۔ یہ رسالہ اختصار کے باوجود اس بحث پر ایک حقیقت افروز تبصرہ ہے جس میں مصنف نے نہایت سلجھے ہوئے اور دلنشیں پیرایہ میں، بصورتِ مکالمہ ان تمام غلط فہمیوں کی اصلیت آشکارا کر دی ہے جس میں ہمارا جوشیلا وطن پرست اور کانگریسی مسلمان مبتلا ہے۔ محض حقائق اور واقعات سے بحث کی گئی ہے۔ انداز بیان کی متانت اور شرافت نے اس رسالہ کی قیمت میں خاص اضافہ کر دیا ہے۔ جو سلیم الطبع مسلمان سیاست حاضرہ کی پیچیدگیوں کو سمجھنا چاہے اسے اس رسالہ کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

مولف نے کانگریس پر اجمالاً تنقید کا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ لیکن مسلم لیگ سے انھوں نے کوئی خاص تعرض نہیں کیا ہے۔ مسلمانوں کی علحدہ تنظیم اور اتحاد کی ضرورت اور اس کے طریقہ کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، نہیں معلوم کوئی مدعی اسلام اس سے کیسے انکار کرے گا؟

آزادی کی جنگ تالیف عبد الوحید خانصاحب بی، اے، ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ قیمت ۱۴ر

ملنے کا پتہ :- عبد الوحید خانصاحب - ۹ لاٹوش روڈ لکھنؤ۔

یہ کتاب بھی سیاست حاضرہ سے تعلق رکھتی ہے جس میں فاضل مصنف نے نہایت کاوش کے ساتھ سیاسی معلومات کا ایک معقول ذخیرہ جمع کر کے کانگریس کے ادعائے آزادی کی حقیقت کھولی ہے اور کانگریسی قول وفعل کا ایک ایسا مرقع ہے جس میں کانگریس کی مہاسبھائیانہ ذہنیت اور اسلام دشمنی کا چہرہ بے حجاب نظر آتا ہے جو بات بھی کہی گئی ہے واقعات کی سند کے ساتھ۔ گو مولف کا خلوص آمیز جوش اور اسلامی غیرت ہر ہر فقرہ سے نمایاں ہے مگر باوجود اس کے قلم کہیں بھی حدود متانت سے متجاوز نہیں ہوا ہے۔ مولف مسلم لیگ کا پرجوش حامی ہے، اس لئے فطرتاً اس نے اس کے نقائص سے بحث نہیں کی ہے، حالانکہ یہ چیز بھی خاص توجہ کی مستحق ہے۔ اگر مسلم لیگ اپنی موجودہ کمزوریوں سے پاک ہوتی تو کانگریس کی فریب کاریاں کبھی بامراد ہونے کا حوصلہ نہ کرسکتیں۔ ہاں مولف کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ حریت پسند مسلمان لیگ پر قبضہ کر کے نہایت آسانی کے ساتھ اس کی اصلاح کرسکتے ہیں لیکن آج کا مسلمان جب دن کو رات کہہ دیتا ہے تو سورج اس کی نگاہوں سے چھپ جاتا ہے اور آسمان کے ہر گوشے میں ماہ و پروین دیکھنے لگتا ہے۔

کتاب میں طباعت کی غلطیاں بہت زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی ترتیب میں بھی اصلاح کی کافی گنجائش ہے اگر اس تمام مواد کو سائنٹفک طریقہ سے ترتیب دیکر بحث کو اور سلجھا دیا جائے تو کتاب کا معنوی حسن اور زیادہ جاذب نظر بن جائے گا۔

زبدۃ السیرۃ النبویہ | تالیف جناب مولانا عمادالدین صاحب انصاری ضخامت ۸۰ صفحات، قیمت ۳؍ ملنے کا پتہ:۔ ناظم کتب خانہ انصاریہ جالندھر۔

یہ کتاب مبتدیوں کے لئے لکھی گئی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ نہایت صاف اور سلیس عبارت میں پیش کی گئی ہے۔ نحو صرف کی ابتدائی کتابوں کے ساتھ اس کا پڑھایا جانا ایک طرف طلبہ کے لئے ادبی مشق کا کام دے گا دوسری طرف دنیا کے سب سے کامل انسان کی سیرت ان کے اخلاق کو سنوارے گی۔

مسلمان

اور

موجودہ سیاسی کشمکش

حصّہ دوم

ترجمان القرآن کی یہ اشاعت خاص جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کو عوام الناس تک پہنچانے کے لئے ہلکے کاغذ پر چھپوا کر ذیل کے نرخوں پر فروخت کیا جا رہا ہے۔ جو مخیر حضرات، یا اسلامی اور سیاسی انجمنیں اپنے اپنے حلقوں میں اس کتاب کو پھیلانا چاہیں۔ وہ ذیل کے نرخوں پر ہم سے طلب کر سکتے ہیں:۔

کرایہ ریل و خرچ ڈاک بذمہ خریدار

قیمت ۱ کاپی	۸ آنے
قیمت ۵ کاپی	۲ روپے ۴ آنے
قیمت ۲۵ کاپی	۱۱ روپے ۸ آنے
قیمت ۵۰ کاپی	۲۲ روپے
قیمت ۱۰۰ کاپی	۴۰ روپے

مہتمم شعبۂ اشاعت دارالاسلام (پٹھان کوٹ ۔ پنجاب)

مسلمان

اور

موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ اول

اس کتاب میں ایڈیٹر ترجمان القرآن کے وہ سیاسی مضامین یکجا جمع کر کے شائع کیے گئے ہیں جو ترجمان القرآن کی اشاعتہائے سابقہ میں محرم ١٣٥٦ھ سے رجب ١٣٥٦ھ تک لکھے گئے تھے۔ یہ کتاب اصل میں اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت، اور مستقبل کے امکانات پر ایک مدبرانہ تبصرہ ہے، جس سے مسلمانان ہند کے دل و دماغ میں ان کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ کوئی لکھا پڑھا مسلمان اس کے مطالعہ سے محروم نہ رہنا چاہئے۔ یہ کتاب اصل لاگت پر فروخت کی جا رہی ہے۔ ذیل کے نرخوں پر آپ اسے طلب فرما سکتے ہیں۔

ایک روپے میں	٥ نسخے	علاوہ محصول ڈاک
نو روپے میں	٥٠ نسخے	کرایہ ریل بذمہ خریدار
پندرہ روپے میں	١٠٠ نسخے	کرایہ ریل بذمہ خریدار

نوٹ: محصول ڈاک فی نسخہ سات پیسے بذمہ خریدار۔ ریلوے پارسل کے ذریعہ کم از کم ٢٥ نسخے منگوانے میں فائدہ رہتا ہے۔

شعبۂ اشاعت دار الاسلام (پٹھان کوٹ - پنجاب)

مسرت سروس پرنٹنگ پریس ریل روڈ لاہور میں طبع ہوا